تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد03 | شمارہ 1 | ماہ جنوری 2018ء

ایڈیٹر

پروفیسر ایس۔اے۔شکور

ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ انڈیا

Edited, Printed and Published by Prof. S.A. Shukoor,
Owned by Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept., Govt. of Telangana,
Printed at M/s. Taahaa Print Systems, Flat No. 304-B, Door No. 5-9-189, Lenaine Estate, Abids Hyderabad
Published from 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر و طابع	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب و تزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
صورت گری	:	محمد جنید اللہ بیگ
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد
ماہ	:	جنوری 2018ء
جلد	:	سوم
شمارہ	:	(1)
ترسیلی اختیار	:	تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین:			
دکنی کلچر اور قومی یک جہتی	:	ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم	7
بے ریا خاکہ نگار ڈاکٹر سید عباس متقی	:	ڈاکٹر محمد انور الدین	12
طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ مجتبیٰ حسین	:	ڈاکٹر مختار احمد فردین	24
جدید غزل کا مہرِ نیم روز خورشید احمد جامؔی	:	ڈاکٹر سید ثناء اللہ	29
غالبؔ کی خطوط نگاری	:	انجینئر محمد عادلؔ فراز	35
بھوپال میں غالب کے ایک خط کی دریافت	:	مریم فاطمہ	39
''من سمجھاون'' پروفیسر عبدالستار دلوی کی نظر میں:		رئیسہ بیگم نازؔ	42
میراں جی خدانما کی نثری خدمات	:	جرار احمد	48
ناول ''امراؤ جان ادا'' تہذیب کے تناظر میں	:	ڈاکٹر جے۔ محمد شفیع	52
احتجاجی رنگ و آہنگ کا شاعر: احمد فرازؔ	:	سلیم انور	57
اکیسویں صدی اور ندائے اُردو	:	حارث حمزہ لون	62
افسانے:			
بابل کا آنگن	:	شاہانہ اقبال	69
چمڑے کا احاطہ	:	محمد ارشد	73
حصہ نظم:			
غزلیں	:	صلاح الدین نیرؔ	77
غزل	:	ڈاکٹر مسعود جعفری	78
غزلیں	:	ڈاکٹر رؤف خیر	79
غزلیں	:	محمد محبوب خان افسر عثمانی	80
غزلیں	:	عمران راقم	81
غزلیں	:	کشور سلطانہ	82

oOo

ہم کلامی

تمام قارئین کی خدمت میں نئے سال 2018ء کی پرخلوص مبارک باد۔ ماہ جنوری کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس شمارے میں حسب معمول ممتاز قلم کاروں کے مضامین' افسانے اور شعرائے کرام کے کلام شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ یہ مضامین وشعری کلام قارئین کی معلومات میں اضافہ اور دلچسپی کا باعث بنیں گے۔

ہماری زندگی میں ماہ جنوری ہر سال آتا ہے اور اس کی نسبت نئے سال کے آغاز سے ہوتی ہے۔ اس نئے سال کے پہلے مہینے میں ہمیں جائزہ لینا چاہیے کہ ہم نے اپنے پچھلے سال کیا کام چھوڑے ہیں۔ پہلے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کاموں میں بہتری لانے اور نئے منصوبے بنانے چاہیے۔ خاص طور سے ہماری طلباء برادری یہ دیکھے کہ گزشتہ سال ہم نے اپنی تعلیم کے شعبہ میں کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اگر کامیابی حاصل کی ہے تو اسے اور آگے بڑھانے کی کوشش کریں' کچھ کمی رہ گئی ہو تو اُس کمی کو نئے عزم وارادہ کے ساتھ پوری کریں۔ مسابقت میں دوسروں کے ہم پلہ بنیں' سائنس اور ٹکنالوجی' صنعت وحرفت' سماجی علوم' طب وریاضی' قانون ہو کہ انتظامی امور سے متعلق تعلیم' غرض ہر شعبہ اور میدان میں آگے بڑھیں۔ اپنا' اپنے والدین کا' ریاست اور ملک کا نام اونچا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان ''اُردو'' کو بھی زندہ رکھیں۔ اپنی تہذیب وثقافت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ گلستانِ اُردو کی آبیاری کریں۔ اپنے نونہالوں کو یہ زبان سکھائیں' اس کی اہمیت سے واقف کرائیں۔ ہماری حکومت اقلیتوں کے ضروری مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ ''اُردو زبان'' کی ترقی کی بھی خواہاں ہے اور اس سلسلہ میں پہلے مرحلے کے طور پر اہم سرکاری محکموں میں 66 اُردو مترجمین کے تقرر کے لئے تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کو ذمہ داری دی گئی ہے' اس خصوص میں جنگی پیمانے پر کارروائی جاری ہے اور امید ہے کہ بہت جلد یہ تقررات عمل میں آجائیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ حکومت کی اس فیاضی سے فائدہ اُٹھائیں اور اُردو زبان کی ترقی وتحفظ کی کوششوں میں لگ جائیں۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا ادبی سفر جاری ہے' اس کے ساتھ ساتھ فروغ اُردو کی سال گزشتہ کی تقریباً تمام اسکیمات وپروگرامس کی تکمیل کردی گئی ہے۔ ان اسکیمات میں مولانا ابوالکلام آزاد قومی ایوارڈ' بیسٹ اُردو ٹیچر وبیسٹ اُردو اسٹوڈنٹ ایوارڈز' اُردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت' چھوٹے اُردو اخبارات کی مالی اعانت' اخبارات کو اشتہارات' نئے سال کے کیلنڈر وڈائری کی طباعت کُل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد میں بک اسٹال کی تنصیب جیسے کام شامل ہیں۔ باقی اسکیمات میں مطبوعات پر انعامات اور کارنامہ حیات ایوارڈ کی عمل آوری کا کام جاری ہے۔ امید ہے کہ یہ اسکیمات بھی جلد تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ اس کے علاوہ جشن تلنگانہ وعثمانیہ یونیورسٹی کی صد سالہ تقاریب کے سلسلہ میں عظیم الشان مشاعرے' شام غزل' سمینارس' قوالی وڈرامے وغیرہ رکھے گئے جنہیں عوام بالخصوص محبان اُردو نے کامیاب بنایا اور بہت سراہا۔ ہماری آگے بھی کوشش رہے گی کہ یہ سلسلہ باقی رہے۔ جس کے لئے آپ سب کے تعاون کا طلب گار ہوں۔

ایس اے شکور

پروفیسر ایس اے شکور

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم
صدر شعبہ اردو، اورینٹل اُردو پی جی کالج حمایت نگر، حیدرآباد
مکان نمبر 537-9-16، نزد پانی کی ٹاکی
ملک پیٹ قدیم، حیدرآباد۔036 500 (تلنگانہ)

دکنی کلچر اور قومی یک جہتی

قومی یکجہتی ہندوستان کا مقدر ہے اور اسی میں ہندوستانی تہذیب کی بقا ہے۔ کیوں کہ جتنے مذہب، طبقات، فرقے، زبان اور بولیاں اس ملک میں دستیاب ہیں وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔ اس کے باوجود سوا سو کروڑ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ ملک دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ جب بھی مفاد پرستوں نے انتشار کے بیج بونے کی کوشش کی تو قومی یکجہتی کی کوششیں بھی تیز تر ہو گئیں۔ آج بھی یہ دوڑ جاری ہے۔ قومی یکجہتی، قومی اتحاد، قومی ہم آہنگی اور قومی ایکتا کی اصطلاحیں آج کل زیادہ ہی زبان زد خاص و عام ہیں اور ہونا بھی چاہئیے کیوں کہ اپنے مقدر سے لڑنا اپنے آپ کو ضائع کرنا ہے۔

ہندوستانی سماج ایک زندہ اور متحرک سماج ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ آپس میں تہذیب، تمدن، ثقافت اور علم و ادب کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ تب کہیں اتحاد، اخوت اور قومی یکجہتی کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ سچ کہا جائے تو ہندوستانی ہمیشہ سے سیکولر رہے ہیں۔ کئی بیرونی اقوام یہاں آئیں اور ہر کسی کو ہندوستانیوں نے خوش آمدید کہا۔ ان سے گھل مل کر رہے کچھ انہیں سکھایا کچھ ان سے سیکھا جس سے یہاں ملا جُلا کلچر فروغ پاتا رہا۔ اس قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں جنوبی ہندوستان خصوصاً دکنی کلچر کا نمایاں رول ہے کیوں کہ دکنی حکمرانوں نے اپنی حکومت کی بنیاد ہی قومی یک جہتی پر رکھی تھی۔

فیروز شاہ بہمنی (جو بہمنی خاندان کے آٹھویں فرمان روا گزرے ہیں) نے پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی نہج پر مغل حکمران اور قطب شاہی سلاطین نے ان دو بڑے طبقات کے درمیان یکجہتی اور رواداری پیدا کرنے کی تحریک چلائی جو برسوں کامیاب رہی۔ بہمنی دور میں ہندو مسلم یک جہتی کی کئی ایک مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں کی معاشرت، طرز تعمیر، ادب و آرٹ اور زبان و ادب سے قومی یک جہتی کی تصویر روشن ہوتی ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں لکھا ہے کہ '' ایک دفعہ وجیا نگر کے حکمراں دیو یارایا نے امراء اور عمائد کو طلب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ گو ہماری سلطنت کا رقبہ بہمنی سلطنت کے رقبے سے کہیں زیادہ ہے اور آبادی کی بھی فراوانی ہے، تاہم

جب کبھی جنگ ہوتی ہے تو بہمنیوں کی فتح کا ڈنکا بجتا ہے اور ہمارے ملک کو خرچۂ جنگ اور خراج ادا کرنا پڑتا ہے۔اس ضمن میں کئی ایک رائیں دی گئیں۔کسی نے کہا کہ مسلمان گھڑسواری اور تیراندازی میں یکتا ہوتے ہیں اور اگر ہمیں جنگ میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی فوج میں مسلمانوں کو بھرتی کریں۔راجا نے اس فریق کی رائے تسلیم کرلی اور فوج میں مسلمان سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کرنے کا حکم نافذ کردیا۔ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ مسلمان سپاہیوں کے لیے ایک مسجد کی تعمیر کی جائے اور ان کے نماز روزے اور دوسرے اسلامی ارکان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔'' (مشمولہ دکنی کلچر۔از۔ہارون خان شروانی۔ص ۲۸)

وجیانگر کے حکمران کی یہ سیاسی مجبوری تھی کہ اس نے اپنی فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی لیکن مسلمانوں کے لیے مسجد بنانا اور ان کے دیگر اسلامی ارکان کی ادائیگی میں مداخلت نہ کرنے کا حکم جاری کرنا' اس حکمران کی مذہبی رواداری ہے۔یہاں کے ہندو حکمراں نے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی رواداری برتی تو مسلم حکمراں نے یہاں کی ہندو رعایا کو نہ صرف گلے لگایا بلکہ انہیں دربار میں عہدے اور منصب بھی عطا کیے۔قومی یک جہتی اک دوطرفہ عمل ہے اور یہ عمل دکنی کلچر کا ہمیشہ سے جُز رہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ شہر ناسک میں سری رام چندر جی نے اپنے بن باس کے دوران میں قیام کیا تھا اور یہ مقدس مقام بہمنی دور میں بھی ہندو یاتریوں کا مرکز رہا ہے۔اس کے علاوہ اولیاء اللہ نے رشد و ہدایت کے ذریعے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو جوڑے رکھا۔آج بھی یہ مزار و مقبرے نہ صرف تعمیر و تزئین کے لحاظ سے ایران و عرب و ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں بلکہ عقیدت کے اعتبار سے قومی یک جہتی کا پیکر ہیں۔حد تو یہ احمد شاہ ولی بہمنی کا عرس اب بھی قدیم آب و تاب سے منایا جاتا ہے۔اس عرس کا آغاز ایک برہمن انجام دیتا ہے۔وہ عرس کے تینوں دن علی الصبح مقبرے میں داخل ہوتا ہے' ناریل پھوڑتا ہے' قبر پر پھول چڑھاتا ہے۔ان ہندو رسوم کے بعد ہی مسلمانوں کو عرس کا جائزہ دیتا ہے۔بھلا قومی یک جہتی کی ایسی مثالیں دنیا کے کس کلچر میں ملتی ہیں؟

پروفیسر ہارون خان شروانی دکنی کلچر کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یوں تو جتنے مزار بزرگانِ دین کے دکن میں ہیں وہ سب مرجع خاص و عام ہیں لیکن گلبرگہ میں ایک مزار ایسا ہے جو اپنی نوع میں یکتا ہے اور جو ایک اعتبار سے دکنی کلچر کا مرقع ہے۔یہ حضرت رکن الدین تولہ کا مزار ہے جو گلبرگہ سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔حضرت نے اپنے وصال سے پہلے یہ وصیت کی کہ جو شخص میرے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے' اس پر لازم ہے کہ آنے سے ایک دن ایک رات پہلے کسی قسم کا گوشت نہ کھائے۔چنانچہ حضرت کے وصال کے ساڑھے چار سو برس بعد بھی اس وصیت کی پابندی کی کوشش کی جاتی ہے'' (دکنی کلچر:ص ۳۰)

بیجاپور کا عادل شاہی دور بھی مختلف اقوام میں اتحاد اور قومی یک جہتی کا مظہر تھا۔عادل شاہی حکمرانوں کو

اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی سلطنت میں ہندو، مسلمان، مرہٹے، کنڑ، دکنی، ایرانی، حبشی، غرض مختلف قومیں آباد تھیں۔اس لیے ان سلاطین نے ہمیشہ قومی اتحاد کے فارمولے پر عمل کیا۔جس طرح راجپوتوں نے مغلوں کا ساتھ دیا اسی طرح مرہٹہ سرداروں کی عادل شاہی حکمرانوں سے وفاداری اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلم آپس میں شیر وشکر کی طرح رہتے تھے۔بقول پروفیسر شروانی کے شیواجی کے دادا مالوجی کو جب اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے پیر و مرشد حضرت شاہ شریف سے دعا کی درخواست کی۔حضرت کی دعا قبول ہوئی اور مالوجی کو ایک کے بجائے دو بیٹے ہوئے۔انہوں نے مرشد کے نام پر اپنے بچوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھا اور شاہ جی کے بیٹے شیواجی ہیں۔ابراہیم عادل شاہ ثانی، عوام میں بہت مقبول تھے۔عوام انہیں ''ابلا بلی'' اور ''محافظ غرباء'' کے نام سے یاد کرتی تھی۔اس کی مشہور تصنیف ''نورس'' ہندی گیتوں کی کتاب ہے جس کے ہر گیت کے آغاز میں '' سُر اور لے'' کا تعین کیا گیا ہے۔بعض گیت ہندو معبودوں کے لیے گایے جاتے ہیں۔

قطب شاہی درباروں نے فارسی اور اردو ادب کو فروغ دیا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے لیکن ان مسلم درباروں نے مقامی اور علاقائی زبان وادب اور ان کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کو جو ترقی دی ہے وہ یقیناً حیرت کی بات ہے۔ ویسے مقامی عوام سے میل ملاپ بڑھانا، ان کے دکھ سکھ میں شامل ہونا، ان کی دلجوئی کرنا اور حسب ضرورت امداد کرنا یقیناً اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا پھر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی حکمت عملی کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔

قطب شاہی دور کے سلاطین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ مذہب کو ریاست سے الگ رکھا اور اپنے عقائد کو کبھی بھی امور سلطنت پر مسلط نہیں کیا۔ وہ انتہائی روادار اور روشن خیال تھے۔ اس ضمن میں ہندوستان کا کوئی بھی مسلم بادشاہ قطب شاہوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔تبھی تو انہیں آندھرا پردیش سے اس قدر ذہنی وابستگی اور جذباتی لگاؤ تھا کہ انہوں نے آندھرا کی تہذیب وثقافت تلگو زبان وادب اور رقص وموسیقی کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان حکمرانوں میں اہم نام ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے ہیں جنہوں نے دکن کی سیاست اور تہذیب پر اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مشہور مورخ ڈاکٹر وینکٹ رمیا ''سلاطین قطب شاہی کی رواداری'' میں رقم طراز ہیں:

''انہوں نے ہندوؤں کی مذہبی تعلیم، پوجا پاٹ اور مندروں کی نگہداشت کے لیے بڑے بڑے گاؤں وقف کرکے اپنی ہندو رعایا کا دل موہ لیا تھا۔ آج بھی دریائے کرشنا کے ساحل پر عبداللہ کے عہد کا ایک کتبہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک گاؤں کسی وید کی برہمن کے نام وقف کردیا تھا تاکہ اس کی آمدنی سے پوجا پاٹ، قربانی اور ویدشاستر کی تعلیم کے اخراجات کی پابجائی ہوسکے۔''

سلطان قلی کی شہادت اور جمشید کی تخت نشینی کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے وجیانگر ریاست میں سات سال تک پناہ لی اور اس دوران اس نے تلگو زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کو نہایت قریب سے دیکھا بلکہ تلگو تہذیب اس کی روح میں رچ بس گئی تھی اور ان ہی لوگوں کی اخلاقی تائید سے گولکنڈہ پر قابض ہوا۔ مذہب و مسلک کے لحاظ سے اس نے بڑی وسیع النظری سے کام لیا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

''اس کی اولاد بھی مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف مذہبوں کے ماننے والی عورتوں سے تھی۔ اس کا بڑا شہزادہ شاہ عبدالقادر کی ماں بیدر کے ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھی۔ شہزادہ محمد قلی اور شہزادہ خدابندہ کی ماں ایک آندھرائی خاتون بھاگیہ رتی تھیں۔ شہزادہ محمد امین کی والدہ ایران کے سادات سے تھیں اور شہزادہ حسین قلی ایک شیعہ خاتون کے بطن سے تھا۔ اس نے آندھراؤں، حبشیوں، دکنی مسلمانوں اور ایرانیوں کو اپنے دربار میں مساوی ترقی کے مواقع دیئے۔'' (مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، جلد سوم، زیر ترتیب سید رفیع الدین قادری، ص ۲۵)

ابراہیم قطب شاہ کے بعد محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا اور اس کے دور میں بھی علم و ادب کی سرپرستی برقرار رہی۔ ویسے یہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے لیکن اس نے تلگو زبان و ادب کے فروغ میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اس کے دربار میں فارسی اور دکنی کے شاعروں کی طرح تلگو شعراء بھی باریاب ہوتے تھے۔ وہ خود بھی اپنے باپ ابراہیم کی طرح تلگو کا شاعر تھا مگر دونوں کا تلگو کلام ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر' محمد قلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ نے اپنے باپ، دادا اور چچا کی روش سے ہٹ کر اپنے آپ کو دکن کی جغرافیائی خصوصیات سے اس طرح ہم آہنگ کرلیا تھا کہ وہ تلنگانہ کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے آباواجداد کے ترکستانی لباس کو ترک کرکے مقامی لباس وضع قطع اور طور طریق اپنائے۔ یہاں تک کہ مقامی زبان تلگو پر بھی عبور حاصل کیا۔ قطب شاہی سلاطین میں وہ پہلا اور آخری بادشاہ ہے جس نے داڑھی کے بجائے مونچھ رکھی اور اپنے کندھوں پر مقامی راجاؤں کی طرح ''انگ وسترم'' کپڑا یا چادر اوڑھا اور ایرانی وضع کے کوٹوں اور قاقم وسنجاب کے نیمچوں اور شملوں کے بجائے دکن کی آب و ہوا کے مطابق دیسی ململ کے ہلکے پھلکے اور مہین کپڑے زیب تن کئے۔'' (تحقیقاتِ اثر' از: پروفیسر محمد علی اثر، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵،۱۴)

سلاطین گولکنڈہ نے سارے علاقے کو اتحاد، اخوت اور بھائی چارگی کا مرکز بنادیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اردو، فارسی اور تلگو شعر و ادب کی سرپرستی فرمائی بلکہ خود بھی ان زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ وہ علم پرور سلاطین تھے جنہوں نے مقامی تہذیب و معاشرت کو گلے لگایا اور اسلامی روایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو بھی پروان چڑھایا۔ شعر و ادب، موسیقی، رقص، تعمیرات میں نہ صرف

اسلامی ثقافت کا عکس ملتا ہے بلکہ مقامی تہذیب وتمدن کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ بلکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''قطب شاہی بادشاہوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ انہوں نے ایک طرف اپنے نسلی خصائل باقی رکھے اور اسلامی علوم کو ترقی دی اور دوسری طرف اپنے ملک کے تہذیب وتمدن کو اپنا کر ایک ''تیسرا کلچر'' پیدا کیا جس میں دونوں کلچر کے صحت مند عناصر موجود تھے۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد اول)، از ڈاکٹر جمیل جالبی، ۲۰۰۴ء، ۳۸۲)

ہندوستان کے کسی شاہی دربار نے اس قدر فیاضی اور علم پروری کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا قطب شاہی درباروں نے انجام دیا ہے اور یہ سارے عالم کے لیے ایک آئیڈیل شاہی دربار ہیں۔ جن کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے وہ کم ہے۔

دکنی تہذیب وتمدن کا قومی یک جہتی کلچر آصف جاہی حکمرانوں میں بھی برقرار رہا گو کہ اب اس کلچر پر ایرانی اور شمالی ہند کلچر کے اثرات بھی مرتب ہونے لگے۔ یہاں کے لباس، طرز تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ پر مغلوں کی تہذیب و ثقافت کے واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ آصف جاہی حکمرانوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے اور منصب عطا کیے اور قومی یک جہتی کے کلچر کو مرنے نہیں دیا۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے جامعہ عثمانیہ (جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا) قائم کر کے اردو دوستی کی ایک یادگار قائم کردی۔ اردو جیا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ زبان گویا قومی یکجہتی کے لیے ترتیب پائی ہو۔

آج بھی دکن کے علاقے میں قومی یک جہتی اپنی مثال آپ ہے۔ اب بھی شادی بیاہ کے بیشتر رسومات ہندو تہذیب کی ہیں مگر مسلمانوں نے اپنالی ہیں۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد کی مختلف رسومات بھی مسلمانوں نے ہندوؤں سے مستعار لے لی ہیں۔ طرز معاشرت پر دیگر اقوام کی معاشرتی اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسلم گھرانوں میں ناشتہ میں کھچڑی، قیمہ، کھٹا اور نہاری کلیجے کے علاوہ اِڈلی، وڈا، دوسہ بھی دکھائی دینے لگا ہے اور بہت سے ہندو بھائی بھی ایرانی حلیم اور حیدرآبادی بریانی پر خوب ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ کئی برسوں بعد تلنگانہ کے پہلے چیف منسٹر جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ نے قلعہ گولکنڈہ میں پندرہ اگست کو یوم آزادی کا پرچم لہرا کے نہ صرف قلعہ گولکنڈہ بلکہ اس دور سے وابستہ تمام یادوں کو روشن کردیا جو اس بات کا عندیہ ہے کہ آج کے حکمران بھی قلعہ گولکنڈہ کی تہذیبی و ثقافتی ورثہ کا تحفظ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ آج بھی اُردو زبان و ادب نے یہاں کی مختلف اقوام کو آپس میں جوڑے رکھا ہے۔ بہمنی دور ہو کہ پھر اس کی پانچ ریاستیں، سلطنتِ گولکنڈہ ہو کہ ریاست حیدرآباد دکن، آندھرا پردیش ہو یا تلنگانہ۔۔۔ ہم نے سیاسی سطح پر بہت کچھ کھویا مگر سماجی سطح پر ہم نے کبھی قومی یک جہتی کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا اور نہ ہی کبھی چھوڑ پائیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد انور الدین
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو،
کالج آف لینگویجس حیدرآباد (تلنگانہ)

بے ریا خاکہ نگار ڈاکٹر سید عباس متقی

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ سوانح نویسی اور خاکہ نگاری ایک دوسرے کے مترادف ہیں لیکن جاننا چاہیے کہ خاکہ ایک الگ صنف ہے اور سوانح نگاری، خودنوشت سوانح یا آپ بیتی علاحدہ صنف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خاکہ نگاری کا فن نہایت کم وقت میں اردو ادب کی اہم صنف بن کر ابھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختصار نویسی کے اس دور میں خاکوں کو سوانح پر ترجیح دی جارہی ہے۔

سید عباس متقی کو خاکہ نگاری پر خاصا عبور ہے۔ انہوں نے بے شمار خاکے لکھے ہیں۔ وہ جس شخصیت پر خاکہ لکھتے ہیں اس شخصیت کی کسی اہم بات کو فروگزاشت نہیں کرتے۔ شخصیت کی بے راہ روی خاکے کو راہ راست پر رکھتی ہے۔ شخصیت کی افراط وتفریط خاکے کے اندر مزاحیہ اور طنزیہ رنگ بھرتی ہے۔ راست رو اشخاص کا خاکہ توصیف نامہ بن کر رہ جاتا ہے۔

پروفیسر مظفر شہ میری کے خیال میں خاکہ نگار اپنے ممدوح میں اپنی ہی آئیڈیل زندگی تلاشتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ خاکہ نگار کو وہی باتیں اور عیوب بھاتے ہیں جو اپنی ذات میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اسی لیے تو سید عباس متقی لکھتے ہیں:

''ہم نے کچھ صاحبان فن کو اپنے فن میں طاق نہ ہونے کے سبب طلاق دے دی ہے اور اپنے اور ان کے درمیان ایک طویل سد سکندری قائم کرلی ہے۔''

(ہیں کواکب کچھ از ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۳۱)

سید عباس متقی اپنے ممدوح میں اپنا آئیڈیل تلاش کرتے ہیں، بالخصوص اپنے دوستوں اور ہم جماعت ساتھیوں کا انتخاب اسی کسوٹی پر کرتے آئے ہیں۔ جب تک انھیں اپنا آئیڈیل ملتا ہے وہ بھی کھل کر ملتے ہیں، بلکہ ان پر کھل کر لکھتے ہیں، خواہ خاکہ ہو کہ مضمون، تہنیت ہو کہ قطعہ۔ بہرحال انھیں اپنا آئیڈیل عزیز ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

''ہم دونوں نے ایک ساتھ یوں تو بہت سے کام شروع کیے، ان میں ایک باقاعدہ روزنامچہ لکھنا بھی ہے۔ درجہ ششم میں تھے کہ ہم دونوں پر ڈائری لکھنے کا بھوت سوار ہوا اور یہ بھوت ہم دونوں پر آج تک سایہ فگن ہے۔ ہم تو خیر ڈائری برائے نام ہی لکھتے ہیں۔ نہ فصاحت نہ بلاغت، نہ موعظت نہ کوئی پیشن گوئی، نہ دنیا کی باتیں نہ سیاست سے بحث، نہ تمدن حاضر پر طعن وطنز، لیکن پرویز کی ڈائری اچھی خاصی ادبی وتہذیبی دستاویز ہے۔ اگر اس کے روزنامچے کو اس

کا ادبی کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے روزنامے میں گویا نثری شاعری کرتا ہے۔ اب وہ ڈائری دکھائے تو کسے دکھائے اور کسے پڑھ کر سنائے۔ وہ کوئی مضمون یا مقالہ تو ہے نہیں کہ کسی محفل میں سنا کر داد وتحسین حاصل کی جا سکے۔ ہم ایسے غریب الطبع آدمی ہیں کہ جو سنائے خوشی خوشی سن لیتے ہیں اور لہک لہک کر داد بھی دیتے ہیں۔ چناں چہ پرویز ہماری ادب شناسی کو غنیمت جان کر اپنی ڈائری کے کچھ اوراق متبرکہ کو کبھی کبھی ہم پر نازل کرتا ہے تا کہ ہم اسے دیکھیں سمجھیں اور جانیں کہ ''دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔''

(ہیں کواکب کچھ از ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۸۷)

ڈاکٹر شفیق پرویز کا شمار سید عباس متقی کے ان دوستوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اسکولی تعلیم کا سفر ایک ساتھ طئے کیا تھا اور آج بھی دونوں دوست باہم محبت والفت کے پیکر ہیں۔

موصوف جنھیں قریب رکھتے ہیں ان کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور ان ہی کے بارے میں تمام معلومات کو جاننا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر فخر عالم اعظمی میں اپنا آئیڈیل یوں تلاشتے ہیں:

''فخر عالم جو بھی سندر رکھتے ہیں وہ جعلی نہیں حقیقی ہوتی ہے۔ اگر ارباب فن وفتن اپنے مفادات کے لیے ان کی اسنادات کو جعلی قرار دیں بھی تو وہ ہماری طرح مجبور ومعذور و مجہول نہیں کہ محض لعنۃ اللہ علی الکاذبین کا نعرہ مار کر خاموش ہو جائیں۔'' (ہیں کواکب کچھ)

اسی طرح جناب یوسف روش سے بھی موصوف کے دیرپا روابط ہیں۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں جیسے یوسف روش صاحب کا چہرہ بشرہ دیکھنے پر سراپا متقی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور سید عباس تخلص ان کا آئینہ دار ہے۔ اس طرح سید عباس متقی اپنے جلیس خاص یوسف روش پر بھی ایک خاکہ سپرد قلم کر چکے ہیں اور اس خاکے میں جا بہ جا اپنا آئیڈیل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''جب موصوف سے دوستی ہوئی اور دوستی نے اپنا رنگ جمایا تو حقیقت روشن ہوگئی اور روش کے دوسرے رنگ اپنی نیرنگیوں کے ساتھ نظر نواز ہونے لگے۔ اس کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ہمارا تخلص ہی نہیں بلکہ آئینہ ہیں، جو جو خوبیاں بلکہ خامیاں ہم میں موجود ہیں مثلاً عشق و عاشقی، نغمہ سرائی، موسیقی، حسن پرستی، شعر گوئی، سنیما بینی، خاکہ نگاری، طنز ومزاح سے اٹوٹ وابستگی۔ اِلّا یہ کہ ہم عارض ماہ سا و لب ہائے گل گوں سے شراب دوآتشہ نچوڑ لینے کے عادی اور وہ کانچ کے پیمانوں سے بوس وکنار کے رسیا اور پھر ایک مؤمن کو گویا اپنا آئینہ مل گیا۔'' (من خوب می شناسم' از ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۱۵)

سید عباس متقی اپنے احوال میں اپنی غلطیوں، خامیوں، بری عادتوں اور علمی وادبی نقائص کو بھی لکھ چھوڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چناں چہ اپنی بے صبری کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی بہت سی باتیں بہت لوگوں کو ناگوار لگتی ہیں۔ اب جو پیکر صبر ہوتے ہیں وہ چپ رہتے ہیں اور جن کا دامن تحمل وشکیبائی سے تہی ہوتا ہے وہ ہماری طرح کہہ

دیتے ہیں یا لکھ مارتے ہیں۔'' (شگوفہ کا نیا شگوفہ، ہیں کواکب کچھ از: ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۳۷)

وہ اپنی لاوَبالی کی بابت کہتے ہیں:

''جہاں ہم ہوتے ہیں وہاں وقت گھٹنے ٹیک دیتا ہے، زہد مجبور ہو جاتا ہے، تقویٰ چولا بدل دیتا ہے، انا وابا دونوں گمراہ ہو جاتے ہیں، کفایت شعاری راستہ بھول جاتی ہے۔'' (ہیں کواکب کچھ)

خاکوں کے متعلق سید عباس متقی کے وژن کا پتا لگانا چاہیں تو ہمیں ان کے مرقوم خاکوں میں جا بہ جا ان ہی کی صورت جلوہ گر نظر آتی ہے اور ان کے خاکوں میں ممدوح تو ہوتا ہی ہے لیکن وہ اپنے احوال و کوائف کو ضرور پیش کرتے ہیں اور اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے۔ اس کے اظہار میں انھیں کوئی تامل نہیں۔ سید انور علی کے خاکے ''یار کہن'' میں کہتے ہیں:

''ہماری شخصیت ہی کچھ ایسی متنازع فیہ ہے کہ آدمی جس قدر ہمارے قریب آتا ہے اتنا ہی ہم سے دور ہوتا ہے، اسی باعث ہم کسی کو بھی اپنے سے قریب ہونے کی اجازت نہیں دیتے، اپنی بیگم کو بھی نہیں۔ ہم کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں کہ چوبیس گھنٹے تحفظ ذہنی سے کام لیتے رہیں۔ انسان واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا پیکر نسیاں ہیں۔ بہ ایں وجہ ہمارے ملنے والے تاریخ کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔'' (سوئے دار چلے (غیر مطبوعہ) از ڈاکٹر محمد انور الدین)

سید عباس متقی شاعری میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ وہ غزل کی بجائے نظم گوئی میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان کی غزلیں باوجود عشق مجازی کے رنگ میں ہونے کے نظم نگاری کے مقابلے میں ماند پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے نظم نگاری کی تقریباً اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت اُردو اور فارسی میں شاعری کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں۔ قطعہ تاریخ لکھنا اور اس قطعے سے تاریخ نکالنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس طرح کئی موقعوں پر انھوں نے تہنیتی، تعزیتی، توصیفی، تضحیکی قطعات تخلیق کیے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے مولانا جلال الدین حسامیؒ کے انتقال پر قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا جس پر ان کے شاعر دوست حضرت یوسف روش نے انھیں تنبیہہ فرمائی۔ اس سارے واقعے کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں:

''جب حکیم حاذق و عالم دین حضرت العلامہ جلال الدین حسامی نوراللہ مرقدہ کا انتقال ہوا تو ایک شاگرد رشید کی حیثیت سے ہم نے ایک قطعہ تاریخ وفات کہہ دیا اور وہ اخبار میں شائع ہوا۔ دوسرے دن علی الصبح روش بھائی دروازے پر نظر آئے۔ ہاتھ میں اخبار کا تراشہ تھا، تیور بگڑے ہوئے، انداز برانگیختہ، لفظوں میں چبھن، جملوں میں کچوکے ۔۔۔ کہنے لگے آپ اردو کے پروفیسر ہیں اور فن تاریخ گوئی میں اس قدر کم زور، ہم نے کہا روش بھائی! آپ کے منہ میں گاؤں کا اصلی گھی اور شہر کی شکر، آخر بات کیا ہے، ارشاد فرمایا۔ تاریخ غلط ہوگئی ہے۔ کل سے کئی بار حساب جوڑ چکا ہوں۔ ہم نے کہا روش بھائی! ایزی لیجیے۔ ماہر فن تاریخ گو شعرا نے بھی کہیں کہیں ٹھوکر کھائی ہے اور ہم تو ابھی بچے ہیں' اگر تاریخ بر آمد نہیں ہوتی تو جانے دیجیے، آپ کا کیا بگڑتا ہے اور آپ

دوستوں پر کیوں بگڑتے ہیں۔ہم نے کہا کتنے کا فرق ہے، روش بھائی بولے پورے پانچ اعداد کا ہے،آپ نے پانچ کا عدد لیا ہی نہیں۔ہم نے کہا محض پانچ سے کیا ہوتا ہے۔ جانے دیجیے آئندہ پورے حروف گن لیا کریں گے۔ہم نے لکیر کھینچ کر سنہ تو برابر لکھ دیا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ وہ مغل اعظم کے پرتھوی راج کی طرح غصے سے لرزنے لگے۔ایسا معلوم ہوا کہ ایک چنگاری تھی جو اُن کے پائے اقدس میں گھس کر شعلہ جوالہ بنتی ہوئی ان کے تالوئے مبارک سے باہر نکل گئی ہے۔'' (من خوب می شناسم)

سید عباس متقی طنز و مزاح کے افق پر اپنی شناخت رکھتے ہیں لیکن طالب علمی کے دور میں وہ نہایت نٹ کھٹ اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے۔جس کی بابت خود رقم طراز ہیں:

''ہم تو استادوں سے پٹائی کو بھی ایک سعادت سمجھتے ہیں۔'' دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو''۔کس کس چیز کو نہ آزمایا گیا' استادوں، بزرگوں اور بہی خواہوں نے ایک توپ داغنی باقی رکھی۔ ورنہ ہاتھ' گال' ٹانگیں نیلی ہوجانا یہ تو معمول کا معاملہ تھا۔'' این سعادت بزور بازو نیست' تانہ بخشد خدائے بخشندہ''۔ وہ تو ہم جیسے بہادر ابن بہادر کا حوصلہ ہے کہ دونوں ہاتھ ہوم ورک نہ کرنے کے سبب متورم ہوگئے ہیں' جغرافیہ کے استاد نے پیٹھ پر ہتھڑ مار مار کے براعظم یورپ اور براعظم ایشیا کے نقشے بناڈالے۔ پہاڑے یاد نہ کرنے کی پاداش میں ازصبح تا نصف النہار بنچ پر ایک مضبوط چٹان کی طرح کھڑے ہیں۔تلگو کے پنڈت نے اپنی مہربانی سے دو دو گھنٹے مرغا بنا کر بانگ دینے کے موقف میں لا کھڑا کر دیا ہے' لیکن کیا مجال جو ہماری فلک آثار استقامت میں کوئی فرق آیا ہو۔کیا مجال جو آفاقی ہمتیں پست ہوئی ہوں' شرارتیں جاتی رہی ہوں' شوخیاں رخصت ہوئی ہوں' قہقہوں سے باز آئے ہوں' تعلیم پر توجہ دی ہو۔'' (ہیں کواکب کچھ)

یہ بیش تر اُردو خاکوں اور خاکہ نگاروں کی اجارہ داری رہی ہے کہ اکثر خاکوں میں خاکہ نگار اپنے ممدوح سے زیادہ خود اپنی تعریف کی فکر میں رہتا ہے۔یہی حال سید عباس متقی کے خاکوں کا بھی ہے۔

اب دیکھیے کہ خاکہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال پر لکھا جارہا ہے اور اس میں ممدوح کے ساتھ اپنا ذکر بھی کس خوبی سے کررہے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب جب تلاش بسیار پر آتے ہیں تو شہنشاہ جذبات جیسی غیر معمولی شخصیتوں کو پالیتے ہیں اور جب ان کا موڈ نہیں ہوتا تو شگفتہ قلم یعنی کہ عباس متقی جیسی معمولی شخصیتوں کو نہیں پاسکتے۔'' (ہیں کواکب کچھ)

حیدرآباد کی ایک انجمن نے انھیں ''شگفتہ قلم'' کے خطاب سے نوازا ہے۔ایک اور خاکے میں لوگوں نے جو اُن سے ادبی اور علمی کام لیے ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہیں:

''پذیرائی تو کیا ہوگی بے اعتنائی کا ہنوز غم جھیل رہے ہیں، یاروں نے ہم سے کتابوں پر مقدمات لکھوالیے، دوستوں نے اپنے دوستوں کے مقالہ جات لکھوالیے۔ احباب نے مضامین کے مضامین لکھوالیے اور جواباً وہ بتا دیا جس کے دانوں میں پروٹین بہت ہوتا ہے۔''

(عجیب شخص ہے، من خوب می شناسم، ص۲۳)

اسی طرح اپنے شاگرد رشید کے خاکے میں اپنا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا اپنی ذات کو شامل رکھ کر شاگرد کو زمانے کے نشیب وفراز سے آگاہ اور متنبہ کررہے ہیں:

''ظاہر ہے کہ اسفل سافلین قسم کے لوگ جب اقتدار پر آتے ہیں تو علم وفن نہیں دیکھتے ''تن'' دیکھتے ہیں یا پھر ''دھن'' دیکھتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے عبرت نہیں لے سکتے تو اپنے استاد ہی سے عبرت لیں کہ ہم نے بھی کبھی انٹرویو دیا تھا اور درجہ اول آئے تھے۔ کمینوں نے گدھوں کا انتخاب کیا اور آج تک ہم کہ اسپ تازیٔ تقدیر کا چابک کھاتے ہوئے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ منہ میں حلت وحرمت کی لگام لگی ہے، گلے میں شرافت کے گھنگھرو بندھے ہیں، آنکھوں پر یک درگیر ومحکم گیر کی اندھیری بجی ہے، گھر سے اسکول جاتے ہیں اور اسکول سے گھر کو آتے ہیں، اسرار خودی ورموزی بے خودی پڑھانا چاہتے ہیں، لیکن ایک گائے اور بکری پڑھا رہے ہیں، فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم جیسی کتابوں کے رموز سمجھانے کی آرزو رکھتے ہیں اور بچوں کو پڑھاتے ہیں ''کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ''۔ ایمان لانا پڑتا ہے کہ علم وفن کا روزگار سے کوئی تعلق نہیں۔''

(ہیں کواکب کچھ)

اپنے دوست الحاج محمد عبدالباسط خاں کے خاکے میں بھی وہ بہ نفس نفیس جلوہ گر نظر آتے ہیں:

''باسط خاں جب ایم۔فل کررہے تھے تو روز اُن سے ملاقات ہوتی تھی، وہ اپنی تحریر کے نوک پلک درست کروانے غریب خانے پر ٹپک جایا کرتے تھے۔ ان کی تحریر کے نوک پلک درست کرنا ہمارے لیے بہت مشکل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی نہایت فرماں بردار شوہر اپنی چڑخ بیوی کو خط لکھوا رہا ہو اور اماں آپا سے ہٹ نہیں رہا ہو۔ ہم نے کہا باسط! مواد تمہارا بیان ہمارا۔ بس جو لکھاؤں بے تکان صرف لکھتے جاؤ، ایم۔فل ہو جاؤ گے۔ اس طرح ہم نے بہت سوں کو ایم۔فل ہی نہیں پی ایچ۔ڈی کروا دیا ہے۔''

(الحاج محمد عبدالباسط خان، من خوب می شناسم، ص ۹۵)

سید عباس متقی جب اپنے ممدوح کا سراپا بیان کرتے ہیں تو وہ اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ ممدوح کی صورت آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ ان کے دوستوں، استادوں، شاگردوں اور ملاقاتیوں پر لکھے گئے خاکوں میں وہی طنز ومزاح کا رنگ ملتا ہے۔

ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیبؔ سے سید عباس متقی کے دیرینہ مراسم ہیں۔ سید عباس متقی نے ایک عبقری شخصیت سے ملاقات نامی خاکہ ان ہی کی نذر کیا ہے۔ جس کا سراپا اس طرح ہے:

''ستواں ناک، آفتابی چہرہ، گہری آنکھیں، دودھ کی طرح اجلا رنگ، شرح وبسط کا جائزہ لیتی ہوئی عمیق نگاہیں، مختصر لیکن دیدہ زیب ڈاڑھی، مضبوط ہاتھ پاؤں، عزم وحوصلے سے مملو سراپا، کردار وخلق کی خوش بو بکھیرتے ہوئے تیور جو کبھی کبھی زود خفگی کی چغلی بھی کھا رہے تھے۔ دل کش انداز، من موہ لہجہ، گرم دم جستجو اور نرم دم گفتگو کا آئینہ دار پیکر۔''(ایک عبقری شخصیت سے ملاقات، من خوب می شناسم، ص ۹)

الیاس مسعود خان کا سراپا پڑھیے، لگے گا کہ

موصوف آپ کے سامنے کھڑے ہیں:

''گورا چٹا رنگ' کھڑی ناک' کشادہ پیشانی' آفتابی چہرہ' کم گوئی سے مزین مختصر دہانہ، فکر و ذہانت کی غمازی کرتی ہوئی حسین آنکھیں، خاندانی شرافت و جبلی نجابت کا آئینہ دار، پرنور چہرہ اس پر وضع دار سرخ و سیاہ' گہری اور خار آثار مونچھیں جو دنیائے نزاکت عارض و گل گوں لب ہائے مئے گوں میں باعث نالہ و فریاد ہی کیوں نہ ہوں لیکن اقلیم وجاہت کے شہ سواروں میں سبب وقار و باعث افتخار گردانی جاتی ہے۔ ان کی بانکی اور وضع دار مونچھیں دیکھنے کے بعد کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اپنی ریا و تصنع سے آراستہ ڈاڑھی انھیں گزران کر اس کے معاوضے میں ان کی بے ریا و مخلص مونچھیں حاصل کرلیں۔ ان کے سراپا کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر لائق استاد نہ ہوتے تو ایک کامیاب ہیرو ضرور ہوتے۔''

(لگے ہاتھوں' از: ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۱۱۱)

مجھے یوسف روش جو حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں، کا سراپا بہت عمدہ لگا:

''ہم نے جب پہلی بار یوسف روش کو دیکھا تو انھیں اپنا تخلص سمجھا۔ سراپا متقی معلوم ہوتے تھے۔ مقطع چہرہ، سینے پر لہراتی ہوئی ریش طویل، آواز اذان پر لگے ہوئے کان، منبر و محراب سے روحانی نسبت، تسبیح و مصلے سے قربت، ذکر و شغل کی خو، تہذیب و تمدن کی خوش بو، ایمان و ایقان کا پیکر، عشق نبوی کا مجسمہ، حق گوئی و بے باکی کا نمونہ، روباہی و دل آزاری سے تنفر، تصنع و پرکاری سے توحش۔'' (من خوب می شناسم، ص ۱۸)

سید عباس متقی کے رفیق دیرینہ ڈاکٹر شفیق پرویز کا سراپا دیکھیے جس میں موصوف ان کے خدوخال کا نقشہ کیا ہی نفاست سے پیش کررہے ہیں:

''وہ بچپن ہی سے خوش اخلاق' خوش شکل' خوش پوش اور خوش مذاق واقع ہوا ہے۔ رنگ سرخ و سفید' بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں' کھڑی ناک' بھرے بھرے گال' چہرے پر تمکنت کے نقوش تو ماتھے پر اقبال مندی کے آثار مستزاد یہ کہ خاندانی خوش حالی نے اس میں ایک بانکپن بھی پیدا کردیا تھا۔'' (ہیں کواکب کچھ، ص ۹۰)

فخر عالم اعظمی کے متعلق خاکے کو سید عباس متقی نے ''شاگرد رشید علامہ ڈاکٹر فخر عالم اعظمی'' کا نام دے کر ثابت کردیا ہے کہ استاذ کو اپنے شاگرد کی علمیت، بلندی اور وقار سے کتنا پیار ہوتا ہے۔ یہی نہیں موصوف نے اس خاکے کو اتنا طول دیا ہے کہ بلاشبہ وہ خود علاحدہ ایک کتابچے کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ سراپا دیکھیے:

''فخر عالم سیرۃً ہی نہیں صورۃً بھی پیدائشی شاعر معلوم ہوتے ہیں اور وہ نقوش صمدانی و آثار حیرانی و پریشانی کہ جو ایک فطری شاعر پر گومیں ناگزیر ہوتے ہیں ان میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، جو انھیں ایک بار دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اب خدا معلوم کیا سمجھ کے دیکھتا ہے۔ کچھ لوگ تو ان کی طویل اور اِدھر اُدھر بل کھاتی ہوئی زلفوں کے سبب ڈر بھی جاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیا کر گزریں۔ بچے اپنی ماؤں سے چمٹ جاتے ہیں اور مائیں اپنے بچوں کے باپوں سے۔'' (ہیں کواکب کچھ)

چاند بھائی، سید عباس متقی کے نہایت معتقد، مخلص

اورجاں نثاردوست ہیں ۔چاند صاحب بذات خود پانچ مساجد کے تنہا خادم ہیں۔سید عباس متقی نے اپنے دیرینہ مراسم کی بنیاد پران پربھی خاکہ کھینچا ہے۔سراپاملاحظہ کیجیے:

''سیاہ فام،گھنی،گنجان اورطویل ڈاڑھی، چیچک کی تاریخی باقیات سے مزین متبسم چہرہ، پان کی سرخی سے آلودہ دندان ودہن، معیانہ قد، گھٹیلا صاف وشفاف بدن، دھلے دھلائے اجلے اور سفید کپڑے،سر پرمنتخب رومال ، باتیں بھی کچھ ایسی باریک اورمعنی خیز کرتے ہیں کہ سامع حیران رہتا ہے کہ یہ غیرتعلیم یافتہ شخص کس مقام عالیہ سے ارشادفرمارہا ہے۔گو اُن باتوں میں کچھ ملنگ باتیں بھی شامل ہوتی ہیں لیکن باتیں ہوتی بڑی دلچسپ ہیں۔''(چاند بھائی،گپ شپ'از: ڈاکٹرسیدعباس متقی،ص۱۲۱)

سیدعباس متقی اپنی تحریروں میں جہاں ممدوح کی تعریف،توصیف اور بڑائی بیان کرتے ہیں وہیں ان کاقلم انھیں عیوب گناتے ہوئے تنبیۂ محمود فرمانے سے نہیں چوکتا۔یہاں پربھی وہ ممدوح کے ساتھ ہردوصورتوں میں اپنی ذات کوشامل رکھتے ہیں۔اِلّا یہ کہ بسااوقات ممدوح کی صرف توصیف سے کام لیتے ہیں۔

مظفرالنساء ناز حیدرآباد کی ایک بلند پایہ شاعرہ اور بزم خواتین کی روح رواں ہیں،کے بارے میں خاکہ نگارنے لکھاہے:

''وہ اس نکتے کوخوب جانتی ہیں کہ فیاضی انسان کو ہردل عزیز بناتی ہےاورخساست وکنجوسی ذلیل کرتی ہے،جس طرح ناز صاحبہ کاہاتھ کشادہ ہے اسی طرح ان کا دل بھی کشادہ ہے۔وہ ملتی ہیں تو دل کھول کر،بات کرتی ہیں تو کسی تحفظ ذہنی کے بغیر،لکھتی ہیں تو ہرمصلحت سے پرے ہوکر،اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی بھید بھاؤ نہیں،ان کی سہیلیوں میں جس طرح مسلم خواتین ہیں اسی طرح ہندو خواتین بھی ہیں اوروہ سب سے شفقت ومہربانی سے پیش آتی ہیں۔''(عزم وعمل کا پیکر،بادشمنان مدارا'از: ڈاکٹرسید عباس متقی،ص۳۰)

اس خاکے میں سید عباس متقی نے موصوفہ کے اوصاف حمیدہ کوگناتے ہوئے رطب اللسان نظرآتے ہیں۔

بعض دفعہ وہ اپنے ممدوح کی تعریف میں مبالغہ کی حد کو بھی چھوجاتے ہیں۔اپنے دوست الیاس مسعود کے خاکے میں مبالغہ آرائی کی جھلک دیکھیے:

''ایک روز ایک عجیب وغریب ڈش کھلائی اور ارشادفرمایا کہ یہ میں نے آپ حضرات کے لیے بنائی ہے۔ ڈش بہت لذیذ تھی،ہم نے تومحض انگلیاں چاٹنے ہی پراکتفا کیالیکن بعض لوگوں نے برکت کےحصول کے لیے رکابی کو گھول کرپی لیا۔''(لگے ہاتھوں،ص۱۱۲)

ایک اورمقام پرسیدعباس متقی اپنے بزرگ دوست سید مصطفیٰ کمال کی توصیف میں یوں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹرمصطفیٰ کمال بہرحال مبارک باد کے مستحق ہیں کہ جنھوں نے نہایت پامردی سے طنزومزاح کی مسلسل خدمات کوخود پرواجب کررکھا ہے۔یقیناً اس ادارے پر کچھ موسم ایسے بھی آئے جن میں ہمتیں پست کرنے والے باد صرصر کے جھونکے چلے جھلسا دینے والی آندھیاں اٹھیں ،

گرداب مایوسی نے پائے استقلال کو متزلزل کرنے کی کوشش کی، دیوار بیزاری نے سد باب کا تہیہ کر لیا لیکن سید مصطفیٰ کمال نے واقعی کمال دکھایا اور بازوؤں کو شل کر دینے والے فلک بوس تموج میں اپنے سفینہ شوق کو ساحل مراد تک پہنچایا۔'' (ہیں کواکب کچھ)

ڈاکٹر شفیق پرویز ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور شگفتہ قلم یعنی سید عباس متقی کے رفیق دیرینہ بھی ہیں، جن سے سید عباس متقی کی دوستی اسکول سے شروع ہوئی ہے اور تا حال اٹوٹ دکھائی دیتی ہے، جس کی بابت رقم طراز ہیں:

''ہم کھیل کے شیدائی وہ پڑھنے کا دیوانہ' ہم لٹو اور پتنگ کے دیوانے اور وہ کتابوں کا کیڑا، ہم باغوں اور چمنوں کے متوالے وہ سودا سلف کی حد میں، ہم حسن و جمال کے شیدائی۔ وہ نماز روزے کا پابند، ہم عاشق مزاج اور وہ معشوق طبع، ہم لاکھ سمجھاتے کہ یہ پڑھنا لکھنا' یہ سوالات یہ جوابات' یہ ہوم ورک' یہ کلاس ورک' یہ سائنس کے فارمولے۔ یہ جغرافیہ کے نقشے' یقیناً مردوں کی مردانگی ہے لیکن بعض وقت دیوانوں کی دیوانگی بھی بن جاتی ہے اور یہ شریف طالب علموں کا شیوہ بھی تو نہیں' چلو تھوڑی دیر ہوا کھا آئیں' گھومیں پھریں' عنفوان شباب کے مزے لوٹیں' گائیں بجائیں' موج مستی کریں' بعد میں ترس جاؤ گے تو یہ موسم' یہ دن نہ آئیں گے، لیکن کیا مجال جو اس کے گوشہ نشین دل نے صحرا نورد دماغ کا مشورہ قبول کیا ہو۔''

(ہیں کواکب کچھ)

سید عباس متقی اپنے ایک مشفق دوست و مخلص صحافی قاری ایم۔ ایس خاں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایم۔ ایس۔ خاں کی شخصیت نہ صرف باطنی خوبیوں سے مالا مال ہے بلکہ خدا نے انھیں ظاہری وجاہت اور خوبی سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔ یہ وجاہت اور خوب صورتی انھیں وراثت میں ملی ہے، اس لیے ان کا سارا کنبہ ہی ہمہ خاندان آفتاب است بلکہ آفتاب و ماہتاب است والی صورت رکھتا ہے۔'' (ایک مشفق دوست ایک مخلص قلمکار، من خوب می شناسم، ص ۱۰۳)

ان کے چاہنے والوں میں چاند بھائی سے سید عباس متقی کی الفت اور یگانگت کا اندازہ لگانا ہو تو ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ صرف خاکے کے اس حصے کو پڑھ لیں:

''نہایت فعال اور کارکرد شخصیت، بس کام سے کام ہے' کسی سے لین نہ کسی سے دین، یہاں کام کیا اور یہاں سے جو فراغت پائی تو وہاں کام کیا، اب یہی دیکھیے چار چار مساجد کی خدمات نہایت تندہی اور حسن و خوبی سے انجام دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور خدمات بھی کس طرح کی، علما اباکریں، زہاد کو پس و پیش ہو، متقی تیوری چڑھائے، عباد کو پسینے چھوٹیں، ائمہ ففرو ہوں، خطبا دامن بچائیں، فصحا گریز کریں، بلغا منحرف ہوں، ناک پر دستی رکھیں اور حفاظ کان پر ہاتھ۔ ہمارا مطلب ہے مساجد کے بیت الخلا کی صفائی ہے۔ واعظ بلند اقبال منبر پر کھڑے ہو کر مسلسل تین گھنٹے وعظ تو کر سکتا ہے لیکن مصلیان مسجد کے وقتاً فوقتاً سکھائے ہوئے ڈھیلے، بول و براز سے معمور نالیوں سے

اٹھانا اس کے بس کا روگ نہیں۔فصحا لچھے دار گفتگو کرتے ہوئے ابی سینا کے نکات تو بیان کر سکتے ہیں لیکن ہاتھ میں برش لے کر پیشاب اور پاخانے کی ضدی باقیات کو رگڑ رگڑ کر ہٹانا، پانی بہانا اور فینا ئیل چھڑکنا ان کا وتیرہ نہیں۔''

(گپ شپ)

سید عباس متقی کے خاکوں کی ایک نرالی بات یہ بھی ہے کہ وہ جس شخص کا خاکہ کھینچتے ہیں اس کے کہیں اجمالاً تو کہیں مفصلاً ذکر چھیڑتے ہیں۔اردو کے اکثر خاکوں میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ خاکہ نگار صرف ممدوح کی تعریف اور توصیف سے کام لیتا ہے اور اس کے عیوب کو پس پردہ ڈال دیتا ہے۔ پتا نہیں اس طرز کی نگارش منصۂ شہود میں لاتے ہوئے اسے کس بات کا خوف رہتا ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ آج بھی حقائق سے پردہ اٹھانے والے قلم کار اور خاکہ نگار عہد ماضی کی طرح عہد حاضر میں بھی تیار بیٹھے ہیں۔

سید عباس متقی ان قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو اپنی ذات پر طنز، مضحکہ اور مزاح کی پھل جھڑیاں چھوڑ کر خود ہی مزہ لیتے ہیں۔ یہ بات حقیقت ہے کہ وہی انسان اپنے عیوب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی جرأت و ہمت کرتا ہے جسے خود اپنے کردار پر پورا پورا ایقان اور بھروسہ ہوتا ہے۔

عباس متقی نے اپنی ذات پر طنز اور مضحکہ آمیز فقرے کسے ہیں جس کا رنگ ان کی تحریر میں ہمیں جابہ جا ملے گا۔ساتھ ہی انھوں نے اپنے ممدوح کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رکھا۔انھوں نے اپنے خاکوں میں ممدوح کے روشن پہلوؤں کو ہی نہیں دکھایا بلکہ ان کی بشری کمزوریوں کو بھی نہایت بے تکلفی سے بیان کرنے کو گوارا کیا ہے اور ان کم زوریوں اور عیوب کو وا کرنے میں وہ کہیں بھی نہ تامل کرتے دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی مضطرب پائے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے استاذ سے لے کر دوست احباب اور شاگرد کے عیوب کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، موصوف کے دیرینہ دوست ہیں جس سے انھیں ممدوح کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی طنز و مزاح نگاری کی بابت سید عباس متقی اپنا وژن اس طرح پیش کرتے ہیں:

''ان کی مثال اکھاڑے کے پہلوانوں کے درمیان ٹہلتے ریفری کی ہے جو خود کبھی پٹ بجا کے نہیں لڑتا، پٹ بجانے والوں کو لڑواتا ہے۔''(شگوفہ کا نیا شگوفہ، ہیں کواکب کچھ)

سید عباس متقی اپنے ممدوح میں پائے جانے والے لطیفے کے رنگ کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔انھوں نے عزم و عمل کا پیکر مظفر النساء ناز نامی خاکے میں محترمہ ناز صاحبہ کی اس عادتِ شریفہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے دوست احباب کی اچھی تصویر کو جمع کرنے کا عجیب و غریب شوق رکھتی ہیں۔اس شوق کی اہمیت اور حیثیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ان کی کوئی سہیلی یا احباب میں سے کوئی انھیں داغ مفارقت دے جائے اور ان کے اہل خانہ کو ان کی مناسب تصویر نہ ملے جس سے اخبارات میں انتقال پر ملال

نوٹ دیا جا سکے:

''ہم نے کہا کہ آپ اس نیک کام کو جلد جلد نہ ادا کریں ورنہ لوگ آپ کو اپنی تصویر دے کر اپنی موت کے تصور میں کھو جائیں گے۔ بعض لوگوں کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے، کہیں صاحب مزاح خواتین اپنی حریف کو یہ کہہ کر نہ چھیڑنے لگیں کہ راہ پر آ جایئے ورنہ ناز صاحبہ کو آپ کی تصویر دے دوں گی۔'' (بادشمنان مدارا)

جب ہم سید عباس متقی کے فن خاکہ نگاری پر بات کرتے ہیں تو ان کی ایک خوبی یہ بھی سامنے آتی ہے کہ وہ خاکے میں ممدوحوں کے علاوہ خود بھی پیش پیش دکھائی دیتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ ممدوح کی شخصیت سے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے خاکہ نگار کی شرکت بے حد ضروری ہے۔

مصطفیٰ خیاط نامی خاکے میں ماہر شیروانی جناب مصطفیٰ ممدوح قرار پاتے ہیں لیکن شیروانی کی توصیف اور زیب تن کرنے کے بعد انسان کے خوش نما دکھائی دینے یا نہ دکھائی دینے کے متعلق انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کا سہارا لیا ہے:

''پنڈت نہرو ہندوستان کی آزادی تک چھریرے واقع ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کے بدن پر شیروانی بہت اچھی معلوم ہوتی تھی لیکن جب وہ وزیر اعظم بن گئے تو شائد وہ خوشی میں موٹے ہو گئے تھے۔ اب انھیں توند بھی نکل آئی تھی لیکن انھوں نے شیروانی نہیں چھوڑی تاہم اُن کے پیٹ کا ابھار اُن کی شیروانی پر ایک داغ معلوم ہوتا تھا۔ ہم سوچتے ہیں کہ انھوں نے ''توند آمد شیروانی برخواست'' پر عمل کیوں نہ کیا۔''

(ناگفتہ بہ از: ڈاکٹر سید عباس متقی)

اپنے رفیق خاص جناب محمد عبدالباسط خاں کے خاکے میں خود خاکہ نگار کو اس طرح دیکھ سکیں گے کہ وہ اپنی سرکاری ملازمت پر ملامت کر رہا ہے:

''باسط کی آواز آئی اس بار تم ناکام نہیں رہو گے، تمہارا نام سرفہرست ہے۔ بھاگو، تمہارے کاسۂ تقدیر میں اسکول اسسٹنٹ کی بھیک اب گرا ہی چاہتی ہے۔ اتنا سنتے ہی ہم ''مارڈن ٹائم'' کے چارلی چپلن کی طرح سر پر پاؤں ہی نہیں اپنا سب کچھ رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر واقعی ہمارے بھیک کے کٹورے میں ترقی کی خیرات ڈال دی گئی۔'' (من خوب می شناسم، ص ۹۵)

اسی خاکے میں آپ نے اپنا عکس اس طرح بھی دیکھا ہے:

''حسینوں نے وقت سے پہلے جوان کر دیا تھا تو فلموں نے وقت سے پہلے بالغ۔ عنفوان شباب نے ابھی سر ہی ابھارا تھا کہ والدین نے اس پر سہرا باندھ دیا۔ یہ آج تک بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ قید و بند کی صعوبتیں کن نامعلوم خدشات کے تحت ہم پر طاری کر دی گئی تھیں اور کن موہوم اندیشوں کے باعث ہمارے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی گئی تھی۔''

(من خوب می شناسم، ص ۹۵)

ایک خاکے میں اپنے شاگرد کو تنبیۂ محمود عطا کر رہے ہیں:

''اب یہ ہماری بھی تو اوج آثار سنک ہی ہے

کہ ہمارے استادوں نے ہم پر تادیب کے لیے ہاتھ اور تنقید کے لیے انگلی ضرور اٹھائی لیکن کبھی توصیف کے لیے قلم نہیں اٹھایا لیکن ہم ہیں کہ اپنے شاگرد پر نہ صرف قلم اٹھا رہے ہیں بلکہ اپنی انا واستغنا پر صدق دل سے استغفار پڑھ کر لکھ بھی رہے ہیں۔'' (ہیں کواکب کچھ)

موصوف استادوں پر زبردست طنز کیے بغیر نہیں رہتے:

''مصطفیٰ ٹیلر کی زندگی نہایت آزمائش اور کڑے امتحان سے گزری ہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے راز ہائے گوناگوں پر سے پردے اٹھاتے ہوئے کہا کہ وہ لڑکپن ہی سے فن خیاطی کی جانب مائل رہے اور ''استاد بھومیا'' ساکن داراب گنج کے ہاں محض چھ آنے روزینہ پر نوکر ہوئے اور اپنی شبانہ روز جد و جہد سے اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ اساتذۂ فن نے کبھی دل کھول کر اپنے شاگردوں کو اپنا فن نہیں سکھایا بلکہ اپنے فن کو اپنے شاگردوں سے چھپاتے رہے اور مزید افسوس کا مقام ہے کہ ''اخفائے فن'' کا سبق انھوں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا تھا۔''

(ماہر شیروانی، ناگفتہ بہ از: ڈاکٹر سید عباس متقی)

خانگی مدارس کے مالکوں پر عباس متقی کا طنز ایسا بھی ہوسکتا ہے:

''کچھ خانگی مدارس کے مالکین بھی عجیب ڈراکیولا قسم کے اشخاص ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے بچوں کے غریب والدین کا بھی خون چوستے ہیں اور پڑھانے والے اساتذہ کا بھی، پھر بھی انھیں گلہ ہوتا ہے کہ ہنوز پیٹ خالی ہے۔''

(الحاج محمد باسط خاں، من خوب می شناسم، ص ۹۸)

جناب قاری ایم۔ایس خاں کے اخبارات میں لکھنے کی عادت کو لے کر ان کے بعض دوستوں بالخصوص خاکہ نگار نے جو طنز کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''ان کے بعض دوستوں نے انھیں دل کی گہرائی سے مشورہ دیا تھا کہ وہ اخبارات میں لکھنے کی بجائے اخبارات بیچنے کا کام کریں، اخبار کے لیے لکھیں گے تو روٹی نہیں ملے گی اور اخبار بیچیں گے تو روٹی ملنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے اور یوں ان کی جیب احمقوں کے سر کی طرح خالی نہ رہے گی لیکن ایم۔ایس۔ خاں نے ان گھٹیا مشوروں پر کبھی کان نہیں دھرا اور کان علم وفن کے جویا رہے۔'' (من خوب می شناسم)

ایک خاکے میں بے روزگاری اور بھوک کی حقیقت کو واکرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بیروزگاری میں دو چیزیں بہت شدت دکھاتی ہیں۔ایک بھوک دوسرے عشق۔اگر آدمی بھوکا بھی ہو اور عاشق بھی تو بچے اس پر پتھر پھینکتے نظر آتے ہیں۔''

(الحاج محمد عبدالباسط خان خدمت وخلوص کا پیکر، من خوب می شناسم)

سید عباس متقی اپنی نجی زندگی میں جب جب نکاح کا تذکرہ چھڑتا تب وہ اپنے شاگردوں کو یاد کیے بغیر نہیں رہتے:

''اب یہی دیکھیے کہ وہ زندگی کی عمر بہاراں سے نبرد آزما ہیں اور ہنوز مصرعِ واحد کی طرح لڑکھڑا رہے

ہیں۔ زندگی ہرگز مصرعہ واحد کا نام نہیں مصرعہ ثانی سے شعر میں رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ہم رباعی کے شاعر ہیں، دو ایک مصرعوں میں ہم اپنے افکار عالیہ کو ظاہر نہیں کر سکتے۔''

(ہیں کواکب کچھ)

سید عباس متقی چاند بھائی والے خاکے میں انسانوں کی انا پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ ایسی ضرب کے انسان کا ضمیر جاگ اٹھے۔ الفاظ دیکھیے:

''کون ہے جو اپنے ہاتھ سے اپنا گل دان نہیں دھوتا اور اتنا رگڑتا ہے کہ کنگورے چمکنے لگتے ہیں مگر آدمی ہے بہت مجبور جو چمکاتا ہے نہ خود دیکھ سکتا ہے نہ دوسروں کو دکھا سکتا ہے اور اتنی غیر شائستہ خدمت کے باوصف پتا نہیں کس منہ سے انا ربکم الاعلیٰ کہنے سے نہیں چوکتا۔'' (گپ شپ)

چاند بھائی کے ڈنڈے کی بابت سید عباس متقی کی خامہ فرسائی کچھ اس طرح بھی دیکھی جا سکتی ہے:

''ڈنڈا کرنے میں چاند بھائی کا جواب نہیں، جب وہ بندموری میں ڈنڈا مارتے ہیں تو سالہا سال سے بند دہانے اور مدتوں سے بندموہانے چیخ و پکار کے ساتھ کھل جاتے ہیں اور مدتوں اپنی کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نو واردوں کو ساغر انتظار نہیں کھینچنا پڑتا اور جو کچھ کہ من جملہ فراغت ہوتا ہے وہ سیدھا منزل مقصود کی جانب دوڑ جاتا ہے۔ یہ سب چاند بھائی کی محنت شاقہ کے منہ بولتے نتائج ہیں۔'' (گپ شپ)

سید عباس متقی کو مختلف لباسوں کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ ذیل میں چوبغلا اور انگ رکھا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے نواب واجد علی شاہ کے موٹاپے کی نسبت مذکورہ لباس کو اہمیت دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''ماضی قریب میں ایک لباس ہوا کرتا تھا جسے چوبغلا اور انگ رکھا کہتے تھے۔ یہ پاجامے کے نیفے کی طرح ہوتا تھا جس قدر توند نکلتی جائے پھیلاتے جایئے، صرف ذرا اس کی ڈوریاں باندھنے کی زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ نواب واجد علی شاہ مرحوم اپنے بے پناہ موٹاپے کے سبب اس لباس کو بہت پسند فرماتے تھے اور یہی ان کے بدن اقدس پر بہت موزوں بھی ہوا کرتا تھا۔ ابعاد ثلاثہ ہر سمت و ہر جہت سے وا ہوتے تھے لیکن کیا مجال جو اس کے حسن میں ذرہ برابر کمی واقع ہو۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر ان کی آدھی تصویر دیکھی جائے تو دیکھنے والا شک میں پڑ جاتا ہے کہ آیا یہ مرد کی تصویر ہے یا کسی صحت مند خاتون کی۔''

(ماہر شیروانی، ناگفتہ بہ' از: ڈاکٹر سید عباس متقی، ص ۲۷)

بہرحال یہ مضمون آپ کے ہاتھوں میں ہے اور میں امید کرتا ہوں کے آپ اس مضمون کو نہ صرف پڑھیں گے بلکہ پڑھتے ہوئے محظوظ بھی ہوں گے۔ اس مضمون میں محض خاکوں سے اقتباس ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے سماج کے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے کردار ہیں، جن کے نقوش کئی لطف دیتے ہیں تو کچھ پرچھائیاں ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ انسان ہونا جتنا ماضی میں مشکل رہا ہے اتنا ہی مشکل حال ہی میں رہا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مختار احمد فردین
حیدرآباد

طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ مجتبیٰ حسین

محبت ایک خوشبو ہے ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
کوئی انسان تنہائی میں بھی تنہا نہیں رہتا

مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز مزاح نگار ہیں۔ دنیا خوب جانتی اور پہچانتی ہے کہ مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز مزاح نگار ہے۔ بقول مضطر مجاز کہ: ''مزاح نگار ہنستے ہنستے ایسے پتے کی بات کہہ جاتا ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں' ادیبوں اور نقادوں کو بھی نہیں سوجھتی۔ مجتبیٰ حسین کا کمال یہ ہے کہ پتے کی ایسی باتیں تحریروں میں جا بجا مل جاتی ہیں اور خشونت سنگھ نے مجتبیٰ حسین کے سفرناموں کو پڑھ کر کہا اور لکھا کہ وہ اپنے آپ پر ہنسے کا بڑا حوصلہ رکھتے ہیں اور پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں کہ مخدوم محی الدین کے بعد مجتبیٰ حسین وہ واحد فنکار ہیں جنہیں حیدرآبادیوں نے ٹوٹ کر پیار کیا''۔ اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورق لکھتے ہیں کہ ہندوستانی مزاح کی نصف صدی کا سہرا برملا طور پر مجتبیٰ حسین کے سر ہی جاتا ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز مزاح نگار ہیں۔

مجتبیٰ حسین 15 جولائی 1936ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1956ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ جوانی سے ہی انہیں طنز و مزاح کی تحریروں کا ذوق تھا جس کی تکمیل کے لئے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے اور وہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا' 'میرا کالم' ان کا مشہور مزاحیہ کالم ہے جو روزنامہ سیاست میں ہر اتوار کو شائع ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین ملک کے پہلے طنز و مزاح کے ادیب ہیں جن کو وفاقی حکومت نے بحیثیت مزاح نگار پدم شری کے باوقار سویلین اعزاز سے نوازا۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین پر مشتمل 22 سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی 7 کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوئیں۔ جاپانی اور اڑیہ زبان میں بھی ایک ایک کتاب شائع کی گئی۔ انہیں 10 سے زائد ایوارڈز حاصل ہوئے جن میں غالب ایوارڈ، مخدوم ایوارڈ، کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ، جوہر قریشی ایوارڈ اور اور میر تقی میر ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کے طویل خدمات کے اعتراف میں کرناٹک کی گلبرگہ یونیورسٹی نے 2010ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے دو سال کے لیے شعبہ اردو میں ان کا بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر تقرر کیا۔ حیدرآباد میں آج بھی وہ

سرگرم ہیں۔کسی بھی ادبی پروگرام میں آپ کی شرکت پروگرام کی کامیابی کا سبب بن بنتی ہے۔

علامہ اعجاز فرخ مجتبیٰ حسین کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'' شاید یہ بات درست ہے کہ ہر فنکار کا فن اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔رہی بات ہنرمندی کی تو موسیقی کی زبان میں یہ اس کے ریاض پر منحصر ہے۔مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے تعلق سے خود ان کا خیال ہے کہ جگر صاحب نے شاہد صدیقی کے سانحہ ارتحال کے بعد ان سے یہ کہا کہ ''شیشہ و تیشہ'' کالم وہ لکھا کریں۔جگر صاحب کے اس فرمان کی تعمیل کو مجتبیٰ حسین ''فرماں برداری'' کہتے ہیں۔ان کے خیال میں وہ تمام عمر یہ فرماں برداری فرماتے رہے، جسے ہم مزاح نگاری سمجھتے آرہے ہیں۔میرے اپنے خیال میں جب تک حسیت قوت متخیلہ اور مشاہدہ کسی فرد میں رچا بسا نہ ہو یا بالفاظ دیگر INBUILT نہ ہو، وہ کبھی فنکار نہیں بن سکتا۔اس کے بعد ترسیل و ابلاغ کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔اس اعتبار سے مجتبیٰ حسین کی فنکاری کا راز دروں جگر صاحب کی نگاہ گوہر شناس ہے کہ انہوں نے ان کے اندر کے فنکار کے مستقبل کی قامت کو اپنی نگاہ کے پیمانے سے ناپ لیا تھا۔اس مختصر سے مضمون میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ان کی تحریروں کا جائزہ لے سکوں اور پھر جب کئی اسکالرز متعدد یونیورسٹیز سے اوزار سنبھالے ان کی شخصیت میں کھدائیاں کرتے ہوئے دفینے برآمد کر کے اپنے آپ پر پی ایچ۔ڈی کے تمغے سجا رہے ہوں، وہاں میری بساط کیا۔اتنی ساری تحقیق کے بعد بھی ہر شخص کی ذات میں کچھ نہاں خانے اور کچھ بھول بھلیاں ایسی ہوتی ہیں، جہاں ہر کس و ناکس کا گزر ممکن نہیں۔بعض لوگ اس سے دانستہ بھی گریز کرتے ہیں کہ کہیں وہ ان بھول بھلیوں میں گم نہ ہو جائیں اور کچھ نہاں خانوں کی سیر ذات کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے کہ بھرے درختوں کے باوجود بن کی تنہائی یا روز و شب کے ہنگاموں میں خود انجمن کی انتہائی کو محسوس کرنا سب کے بس کی بات بھی نہیں ہوتی۔''

اُردو ادب میں مجتبیٰ حسین کو جو مقام حاصل ہے جیسے لگتا ہے کہ یہ صدی ان کی ہی ہے۔اس شعر کے حوالے سے:

کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

ooo

یہ 1962 کی بات ہے جب سیاست کے مشہور مزاحیہ کالم لکھنے والے جناب شاہد صدیقی کا انتقال ہوگیا تھا۔اس کے بعد جگر حسین کے حکم پر مجتبیٰ حسین صاحب نے اس اہم کام کی ذمہ داری سنبھالی اور دنیا نے دیکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس میدان کے بادشاہ بن گئے۔

''جو لوگ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری ایک کڑی آزمائش کا نام ہے۔اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔بائیس برس پہلے کی رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میری چھ سالہ بیٹی اچانک اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔علی الصبح مٹی کا قرض مٹی کو سونپ کر قبرستان سے واپس ہوا۔ابھی

ہاتھوں سے قبر کی مٹی بھی اچھی طرح نہیں جھاڑی تھی کہ مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ گیا۔ کالم چھپا تو لوگوں نے اس کی بے حد تعریف کی۔ سبحان اللہ۔ ماشاءاللہ۔ میں حیرت میں پڑ گیا۔ لوگوں کو اُن حالات سے واقف کرانے کی کوشش کی جن میں، میں نے یہ کالم لکھا تھا۔ پھر یہ بھی کہا:

''بیٹی تو روز روز نہیں مرتی لیکن اخبار کے کالم کو ہر روز زندہ رکھنا پڑتا ہے۔''

اس کے جواب میں لوگوں نے میری طرف یوں دیکھا، جیسے کہنا چاہتے ہوں'' خدا کرے، تیری بیٹی ہر روز اسی طرح مرتی رہے اور ہمیں تیرے دلچسپ کالم پڑھنے کو ملتے رہیں۔''

اس واقعہ کے بعد اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مزاح نگاری، دراصل اپنے اور دوسروں کے دکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ چھپانے، کبھی اسے اجاگر کرنے، درد کے چہرے پر خوش گواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام ہے۔ مزاح نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اُس کے بعد سے میری مزاح نگاری کا یہ نصب العین بن گیا کہ آنکھوں میں قہقہے اور ہونٹوں پر آنسو سجاتے چلے جاؤ۔ سچا مزاح نگار وہی ہے جو اپنے غموں کو چھپا کر دوسروں کو زندگی کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس شعر کی روشنی میں:

نئے نظام سے نامطمئن طبعیت ہے
اک انقلاب کی دنیا کو پھر ضرورت ہے

لوگ پیٹ کے لئے روتے ہیں اور میں پیٹ کے لئے ہنسنے لگا اور اب تک ہنستا چلا جا رہا ہوں۔ ان کا پہلا مضمون غالب کی طرفداری میں ماہنامہ صبا میں چھپا تھا جو 1964ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ بھی اس کتاب سے پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون کی ادبی حلقوں میں بہت پزیرائی ہوئی تھی۔

مجتبیٰ حسین کی ایک تحریر'' سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا'' بڑی مقبول ہے۔ اس میں ان کا انداز بھی نمایاں ہے اور ایک پیغام بھی بیان کرتے نظر آئے۔ اسے لکھتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نہ گھبرائے، نہ ہچکچائے۔ بے دھڑک اپنی حیثیت کو رقم کیا اور اس بحث کا حصہ بن گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

'' میں نے کہا'' بیگم! کان کھول کر سن لو۔ یہ پہاڑ اور قدرتی مناظر، سب بہانے بنانے کی باتیں ہیں۔ آج تک کوئی سوئزر لینڈ میں صرف پہاڑ دیکھنے کے لیئے نہیں گیا۔ پہاڑ کی آڑ میں وہ کچھ اور کرنے جاتا ہے۔ سوئزر لینڈ کے پہاڑ اس لیئے اچھے لگتے ہیں کہ ان کے دامن میں سویٹذر لینڈ کے وہ مشہور و معروف بینک ہیں جن میں پیسہ جمع کراؤ تو پیسہ جمع کرانے والے کی بیوی تک کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں اس کے شوہر کا پیسہ جمع ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ بعض صورتوں میں خود بینک انتظامیہ کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اسکے بینک کس کا کتنا پیسہ جمع ہے۔ ان بینکوں کو وہاں سے ہٹا لو تو سوئزر لینڈ کے قدرتی مناظر اور پہاڑوں کی ساری خوبصورتی دھری کی دھری رہ

جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نے پہلگام، گلمرگ اور پیر پنجال کے پہاڑ دیکھے ہیں اسے سوئزر لینڈ کے پہاڑ کیا پسند آئیں گے۔ رہی برف کی بات تو اسے تو روز ہم ریفریجریٹر میں دیکھتے ہیں۔ اب بتاؤ سوئزر لینڈ میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہاں کسی زمانے میں یہاں کی گھڑیاں مشہور تھیں۔ اب جاپان نے انکی ایسی تیسی کر دی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ گھڑی سازی کے معاملہ میں ہر ملک کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سوئزر لینڈ کی گھڑی اب ٹل چکی ہے۔''

مجتبیٰ حسین دوستوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ دوستی اور وضعداری نبھانا انہیں خوب آتا ہے۔ دلی کی گہما گہمی میں وہ کبھی حیدرآبادی دوستوں کو کبھی نہیں بھولے۔ دلی میں مزاحیہ مشاعرہ کروائے' حیدرآباد سے شاعروں کو بلوائے۔ ہندوستان بھر میں محفل مشاعرے کروائے۔ مجتبیٰ کی تحریروں کی عوامی مقبولیت کی وجہ ایک اور یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں طنز کی کاٹ کے بجائے مزاح کی چاشنی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مضامین سے محفلوں میں قہقہوں کی فصلیں اگاتے گذر جاتے ہیں۔ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین پڑھنے کے ہی نہیں بلکہ سننے کے بھی قلمکار ہیں۔ ہمارے بعض قلمکار ایسے ہیں جو اپنی تحریروں سے جادو تو جگا دیتے ہیں لیکن جب اسٹیج پر آتے ہیں تو سامعین کو اپنا نہیں سکتے۔ لیکن مزاح کے بے تاج بادشاہ اسٹیج پر بھی اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔ سامعین کے معیار اور ذوق پر ان کی نظر خوب رہتی ہے۔ اور جن جن محفلوں میں آپ نے جو کچھ کہا اپنی تحریر و تقریر کے حوالے سے ان سے سامعین بخوبی پہلے سے ہی واقف ہوتے ہیں۔ جس سے آپ کی کہی بات اور تحریر یہ دونوں خوبیاں جو آپ میں پائی جاتی ہیں سامعین ان ہی باتوں کو داد دے کر قبول کرتی ہے۔ قدرت نے آپ کے اندر وہ خوبیاں بھی دیں تمام باتیں فلسفیانہ انداز میں آپ کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں سامعین ان ہی فلسفیانہ باتوں میں اپنی اصلاح کو ڈھونڈتے ہیں۔ آپ نے انسانی زندگی کے تمام سلگتے ہوئے مسائل پر اپنی بات مزاح کے ذریعہ رکھی اور لوگوں نے اسے قبول کیا۔ آپ کی مقبولیت دنیا کے کونے کونے میں ہے اور پائی جاتی ہے۔ آپ کا حسن سلوک ایک معمولی انسان سے لے کر اعلیٰ عہدے کے انسانوں تک ایک ہی جیسا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے نقاد وادیب شاعر' تجزیہ نگار' صحافی اور معمولی انسان سے بھی آپ کے تعلقات ہے۔ سبھی کو آپ نے طنز و مزاح کی ایک ہی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کی مقبولیت حیدرآباد سے زیادہ دلی میں رہی ہے اور حیدرآباد میں بھی آپ کی مقبولیت یکساں رہی ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے لکھا مجتبیٰ حسین کے مزاح میں اپنائیت اور سادگی اتنی ہے کہ پڑھنے والا فوراً ان کے تجربے میں شریک ہوجاتا ہے۔ اور ان ہی کی نظر سے مناظر کو دیکھنے لگتا ہے۔

مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انہیں واقعہ نگاری اور مرقع

کشی میں کمال حاصل ہے۔

وحید اختر لکھتے ہیں ''اگر مجھ سے پوچھا جائے ہندوستان کے مزاحیہ ادب کی بھرپور نمائندگی کونسا شہر کرتا ہے تو بلا جھجک حیدرآباد کا نام لوں گا اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حیدرآباد کی نمائندگی کون کرتا ہے تو میں ایک ہی نام لے سکتا ہوں وہ ہے مجتبیٰ حسین' جو خصوصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی حیدرآبادیت ہے۔ مجتبیٰ حسین کے طنز و مزاح کی دنیا میں سمندر کی مانند جو کچھ دیئے ہیں آج کی نسل اور آنے والی نسل کو تحقیق و ریسرچ کے لئے ایک نیا باب کھولتی ہے۔ یہ کل ہی کی بات ہے آپ کے گفتگو کرنے کا نرم لہجہ میں اپنا نکتہ نظر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک شخصیت کا بڑا وصف ہے۔ جس نے آج کو اتنی بلندیوں تک پہنچایا۔ راقم الحروف کا یہ احساس ہے کہ مجتبیٰ حسین کامیابیوں کی اتنی بلندی پر پہنچنے کے باوجود ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح کے ادبی خدمات کو اگر میں تحریروں میں قلمبند کر سکا تو ان ہی کی دی ہوئی دو کتابیں پڑھنے سے جو حاصل ہوا اس کا نتیجہ فکر یہ ہے کہ اس صدی میں طنز و مزاح کے میدان میں مجتبیٰ حسین سے کوئی بڑا نظر نہیں آتا۔ مجتبیٰ حسین درد رکھنے والے عظیم انسان ہیں' حالات کے اتار چڑھاؤ ان کے عزائم کو پست نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ شعر ان پر ہی صادق آتا ہے۔

میں اپنے فن کی بلندی سے کام لے لوں گا
مجھے مقام نہ دو میں مقام لے لوں گا

☆☆☆

منفی ذہنیت

بعض لوگ منفی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر انہیں زندگی میں چند ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ اسے پوری زندگی کا روگ بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنی مایوسی کو دوسروں تک منتقل کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ جب کسی محفل میں بیٹھتے ہیں تو مایوسی ہی کی بات کرتے ہیں۔ کسی کو خوش دیکھتے ہیں تو اسے اداس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر چیز کے منفی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور ایک مفکر کی دی گئی مثال کے مطابق مکھی کی طرح جسم کے اسی حصہ پر بیٹھتے ہیں جو سڑا گلا ہو۔ اگر اپنی خوش قسمتی اور دوسروں کی بدقسمتی سے یہ شاعر' ادیب' کالم نگار' صحافی' ڈرامہ نگار' مصور' موسیقار' گلوکار یا اداکار بن جائیں تو اپنی اس مایوسی کو پورے معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر انہیں کسی فن میں نقاد کی حیثیت حاصل ہو جائے تو پھر مایوسی پیدا کرنے والی ہر تحریر' ہر نظم' ہر نغمہ' ہر تصویر اور ہر ڈرامے کو شاہکار اور شہ پارے کا درجہ بھی مل جاتا ہے۔ جو لوگ بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں' ان کی زندگی پھر غم اور مایوسی کی تصویر بن جاتی ہے۔ جو کوئی بھی مایوسی کو اپنا مقصد حیات بنانا چاہے اس کا تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن جو اس مایوسی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہیاس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مکمل طور پر اجتناب کرے۔ انہیں دور سے آتا دیکھے تو ان سے کنارہ کر لے۔ اگر کسی محفل میں انہیں بیٹھا دیکھے تو اس جانے سے گریز کرے۔

(اقتباس مضمون ''حالات سے مایوس نہ ہوں'' از: مبشر نذیر' رہنمائے نوجوانان سپلمنٹ' صحافی دکن' 24 جنوری 2018' ص:4)

oOo

ڈاکٹرسید ثناءاللہ
کوآرڈ نیٹر ،شعبۂ اردو، کوویمپو یونیورسٹی
سہیادری کالج کیمپس، شیموگہ، کرناٹک۔577 203

جدید غزل کا مہرِ نیم روز خورشید احمد جامیؔ

دکن کے جن شعراء نے اپنی تخلیقی انفرادیت اورشاعرانہ ہنرمندی سے اُردو شعروادب کے معیارو منہاج کونئی شناخت بخشی ان میں ایک اہم نام خورشید احمد جامیؔ کا بھی ہے۔خورشید احمد جامیؔ اُردو کے ان اہم ترین جدید شعراء میں سے ایک ہیں جن کی وجہ سے جدید شعری حسیت اور شاعرانہ ہنرمندی کو اعتبار حاصل ہوا۔خورشید احمد جامیؔ کو جدید شعراء میں یوں بھی انفرادی مقام حاصل ہے کہ انہوں نے جدید حسیت اور طرز کو اس وقت اپنایا اور اسے اعتبار بخشا جب اُردو میں جدیدیت کی لہر زیریں سطح پر تھی۔خورشید احمد جامیؔ کا مجموعہ کلام ''برگ آوارہ'' جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا وہ جدید غزل گوشعراء کے اہم ترین مجموہائے کلام میں مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ان کا مجموعہ کلام ''برگ آوارہ'' اپنی نئی لفظیات ،انوکھی علامت اور جدید حسیت کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔

'برگ آوارہ' کے پیش لفظ میں خورشید احمد جامیؔ نے اپنے شعری موقف اور حالات کی ستم ظریفی کے بارے میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''وقت کی تیز وتند آندھیوں میں زندگی اس برگ آوارہ کی طرح ہے جو اپنا ماضی، حال اور مستقبل کھو چکی ہے۔جلتی ہوئی تنہائیوں ،ٹوٹے ہوئے خوابوں اورزخم خوردہ تجربوں کے اس صحرا میں جہاں پرگذرا ہوا پل ایک صدی کی بات معلوم ہوتی ہے تخلیق اوراظہار کی مختلف جہتیں ان گنت چھوٹی بڑی آوازوں کے شور میں اپنی آواز کو ڈھونڈنے پہچاننے اور پانے کی خواہش کے سوا کچھ اورنہیں۔فن کی دائمی قدروں اوران مٹ رنگوں کے بارے میں سوچنا آج کے دور کا مقدر ہے۔عمل اور ردعمل کی برق رفتاری صرف لمحاتی تصورات کو جنم دیتی ہے اورکل کیا ہوگا کوئی نہیں جانتا ہے''

خورشید احمد جامیؔ ان جدید شعراء کی طرح محض نام کے یا فیشن کے جدید شاعرنہیں ہیں جو محض چند الفاظ و علامات کے برتنے تک ہی اپنے آپ کو جدید شاعر سمجھتے ہیں۔خورشید احمد جامیؔ دراصل جدید حسیت کے ایک تخلیقی شاعر ہیں ۔ایسے شاعر جن کے

یہاں امیجری بھی نئی ہے اور علامتیں بھی نئی ہیں اور ان سب کا استعمال بھی نئے ڈھنگ سے ہوا جو نئی معنویت کو خلق کرنے میں شاعر کی تخلیقی بصیرت کو مہمیز کرتی ہے ۔ ویسے صلیب ، سحر، خیمۂ درد، دشت ، کتابِ گل، قیمتِ عرضِ ہنر، برگِ آوارہ، سفیرانِ سحر، وقت کی دھوپ ، نگارِ صبح وغیرہ ان کی پسندیدہ علامتیں ہیں جن کے گرد وہ اپنی فکر اور فن کے خوب صورت تاج محل تعمیر کرتے ہیں اور غزلیہ شاعری کی روایت میں جدّت کا احساس پیدا کرتے ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کناروں پر اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں آؤ
وہاں اک روشنی سی ہے جہاں طوفان اٹھتے ہیں

پگھلا دیے ہیں تلخ حقائق کی آگ نے خوابوں
کی چاندنی سے نہائے ہوئے بدن

گھر سے دن کے ساتھ نکلا تھا کوئی
رات کے جنگل میں جا کر کھو گیا

یہاں یہ بات یاد رہے کہ خورشید احمد جامؔی کی شاعری جدید حسیت کے باوجود محض وجود کی گمشدگی کا نوحہ نہیں بنتی ہے۔ ہاں عام انسانوں کی زندگی کا کرب ان کی شاعری کے رگ و ریشے میں شعریت کا لہو بن کر ضرور دوڑتا ہے۔

مظفر حنفی کو جدید شعراء میں اس لئے اوّلیت حاصل ہے کہ جدید شاعری کا پہلا مجموعہ ''پانی کی زبان'' انہیں کا مجموعہ کلام تھا اور ان کی کتاب ''جدیدیت ، تجزیہ و تفہیم'' پہلی ایسی کوشش تھی جس نے جدید ادب پر سنجیدہ گفتگو کے لئے لوگوں کو آمادہ کیا اور جدیدیت کے خد و خال کے ساتھ ساتھ جدید ادب کے نقوش بھی اجاگر کئے ۔ اس کتاب کو مظفر حنفی نے جن تین جدید شاعروں کے نام معنون کیا تھا ان میں خورشید احمد جامی کا نام بھی شامل تھا۔

مظفر حنفی لکھتے ہیں کہ:

''تین فنکار خورشید احمد جامؔی، حسن نعیمؔ اور مخمورؔ سعیدی ایسی انفرادیت، اہمیت اور ادبی خصوصیات کے حامل ہیں کہ انہیں نہ صرف یہ کہ نئی غزل کے پیش رو ہونے کی سعادت حاصل ہے بلکہ وہ نئی نسل کے نمائندہ اور منفرد غزل گویوں کی صفِ اوّل میں بھی شمار کئے جاتے ہیں ۔ جامؔی نے جدیدیت کو شعوری طور پر قبول کیا کیوں کہ ۱۹۶۰ء سے بہت پہلے ان کا مجموعہ کلام منظر عام پر آچکا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''برگ آوارہ'' منظر عام پر آیا تو اس شان سے کہ کسی سطح سے یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ یہ کسی کہنہ مشق کلاسکی شاعر کے رشحاتِ قلم ہیں ۔ پیچیدہ اور نازک جذبات پر قدرت، کلاسکی رچاؤ کے ساتھ عصری حسیت اور تلخ و ترش حالات کی عکاسی میں شعریت پیدا کرنا اور نئی لفظیات سے غزل میں غنائیت پیدا کرنا خورشید احمد جامؔی کے بنیادی اوصاف ہیں ۔ افسوس کہ وہ نئی غزل چار پانچ سال ہی کہہ سکے، پھر ان کی عمر نے وفا نہ کی ۔ اپنے ایک ہی مجموعہ غزل سے انہوں نے نئی

غزل کی تاریخ میں جاودانی حیثیت حاصل کر لی۔اس اعتبار سے انہیں ہندوستان کا شکیب جلالی سمجھنا چاہئے۔''

یہ ہیں جدید غزل کے اہم ترین شاعر اور اُردو تحقیق وتنقید کے اہم نام مظفر حنفی کے اعترافات۔ مگر افسوس کہ بعد میں لوگوں نے خورشید احمد جامؔی کو اس طرح یاد نہیں رکھا جس طرح انہیں یاد رکھنا چاہئے تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خورشید احمد جامؔی کے اکثر اشعار آج بھی جدید شعراء میں سے کئی شعراء کی بہ نسبت زیادہ شدّت سے قاری کو متاثر کرتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

موسم گل بھی جب آیا ہے تو آتے آتے
ریگزاروں سے کڑی دھوپ اٹھا لایا ہے
خود مرے حالات بھی جلدی میں تھے
وقت کو تم نے بھی ٹھہرایا نہیں
نیند آئے تو مجھے رات کا مجرم سمجھو
چاند نکلے تو آج سے گنہ گار کہو

خورشید احمد جامی کی شاعری میں زندگی کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کی تشنہ کامیوں کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ان کے لئے زندگی قید حیات اور بند غم کی تعبیر ہے۔مگر اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر خود ترحمی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتے ہیں مگر زندگی کے غموں اور اس کی کربناکی کو بھی وہ شعر کرنے سے کبھی نہیں چوکتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

اے خدا تیرے اس جہنم میں
زندگی سے بڑا ہے کوئی عذاب
کچھ نہیں ان راستوں میں دور تک
کھڑ کھڑاتے خشک پتوں کے سوا
کس کو الفاظ کے جنگل میں صدا دیتے ہو
زندگانی تو کتابوں سے نکل آئی ہے
یہ اور بات ہے کہ تعارف نہ ہو سکا
ہم زندگی کے ساتھ بہت دور تک گئے

آپ نے دیکھا کہ جامؔی نے زندگی کی تلخیوں اور اس کی ناکامیوں کا کس کس انداز سے ذکر کیا ہے۔ یہ محض شاعر کی زندگی کی ناکامیوں کا نوحہ نہیں ہے یہ اجتماعی زندگی کا نوحہ ہے جو جنگ و جدال اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر عام انسانوں کے لئے کربِ مسلسل کا استعارہ بن چکی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جدید شاعروں میں سے کئی شاعر ایسے تھے جو ترقی پسندی کی راہ سے جدیدیت تک پہونچے تھے' انہیں میں خورشید احمد جامؔی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انہیں کلاسیکیت ، ترقی پسندی اور جدیدیت کا حامل ایسا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے جس نے تمام نظریات ورجحانات سے عطر کشید کیا مگر تخلیقی وفور کے معاملے میں اپنے دل کو ہی امام بنایا یہی وجہ ہے کہ ان کی

شاعری اُردو کی جدید شاعری کی بھیڑ میں گم نہ ہوسکی اور اپنے وجود کا شدید ترین احساس دلایا۔ چوں کہ خورشید احمد جامؔی کی شاعری میں تنوع بھی خوب پایا جاتا ہے اس لئے انہیں محض کسی ایک موضوع کے حوالے سے یاد کرنا اور اسی موضوع کے تناظر میں دیکھنا اور دیکھنے پر اصرار کرنا قطعی مناسب نہیں ہوگا۔ ان کی شاعری میں فکری قوت مندی کا احساس بھی پایا جاتا ہے اور جذبات واحساسات کی شدت کی آنچ بھی لپکتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے نوحے بھی سناتے ہیں اور زندگی سے محبت کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بڑی رنگا رنگ اور دلکش معلوم ہوتی ہے

یاد پڑتا ہے زندگی نے کہیں
نرم لہجے میں نام پوچھا تھا

مگر زندگی کا نرم لہجے میں نام پوچھنا زندگی کے کشاکش کے درمیان کہیں گم ہو جاتا ہے مگر شاعر امید کی کرن کو معدوم نہیں ہونے دیتا ہے اور زندگی کے سانحوں اور حادثوں کو شعری پیکر میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے جتنے روپ خورشید احمد جامؔی کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں اور اس کی جس خوبصورتی سے وہ پیکر تراشی کرتے ہیں اس کی مثال کسی جدید شاعر کے یہاں شاید و باید ہی دیکھنے کو ملے گی۔ سرور الہدیٰ نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

''مجھے نہیں لگتا کہ جدید غزل میں خورشید احمد جامؔی کے علاوہ کسی اور نے زندگی کے مختلف خدّ وخال کو اتنے دلکش انداز میں ابھارا ہوگا۔ ان کی ذہنی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہ ترقی پسندانہ تھا۔ خورشید احمد جامؔی کو اس امر کا احساس تھا کہ زندگی اور سماج سے وابستگی کا مطلب قطعی یہ نہیں ہوتا کہ زندگی کے تاریک پہلوؤں کو تاریک نہ کہا جائے۔ خورشید احمد جامؔی کی غزلوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ خیال وفکر کی کرنیں زندگی اور سماج سے پھوٹتی ہیں مگر جامؔی کا سیاسی وسماجی شعور انہیں مداری نہیں بناتا اور نہ انہیں چیخ وپکار پر آمادہ کرتا ہے۔''

ہم دیکھتے ہیں کہ خورشید احمد جامؔی کی غزلیں بہت حد تک سرور الہدیٰ کی باتوں کی تائید کرتی ہیں اور زندگی کی محرومیوں اور اس کی کربناکیوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر اپنے قارئین کو اس کے روپ اور بہروپ سے روشناس کراتی ہیں۔

چاہتیں ہیں کہ پگھلتی ہوئی زنجیریں
زندگی ہے کہ سلگتا ہوا ارماں کوئی
زندگی بھر مجھے دوزخ میں جلایا جامی
زندگی سے مری بس اتنی شناسائی ہے
زندگی آج وہ صحرائے الم سے ہے جس میں
آرزوؤں کے بھٹکتے ہوئے آہو بھی نہیں
نہ جانے آج ہے کس دشتِ نارسائی میں
وہ ایک شخص جو کل تک شریکِ محفل تھا

ooo

ان اشعار کو دیکھنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ خورشید احمد جامؔی نے کس خوبصورتی سے لفظوں کو استعاروں میں بدل دیا ہے اور پیکر تراشی کا ایک جہانِ نو خلق کر دیا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اُردو غزل کی لفظیات پہلے سے مرتب شدہ تھی، خورشید احمد جامؔی کو بھی غزل کی وہ مرتب شدہ لفظیات اور طرز وراثت میں ملی تھی مگر خورشید احمد جامؔی چوں کہ ایک سوچتا ہوا تخلیقی ذہن رکھتے تھے اور اپنی روایت سے پوری طرح آگاہ تھے اس لئے انہوں نے روایت میں جدّت اور جدّت میں ندرت پیدا کر کے اپنے تخلیقی وفور کا ثبوت پیش کیا اور اُردو غزل کو نئی لفظیات ، نئی ترکیب اور نئے استعاراتی نظام سے روشناس کر کے اپنے لئے ایک بالکل نئی راہ نکالی اور اپنے قدموں کے نشانات اس راہ پر اس طرح ثبت کر دیے کہ ان کے ہمعصروں نے ہی نہیں بلکہ بعد میں آنے والے لوگوں نے بھی انہیں منزل کے نشان کے طور پر دیکھا اور اپنی تخلیقی پیاس بجھانے کے لئے نئی لفظیات کے وضع کرنے کی جرأت دکھائی۔خورشید احمد جامؔی کے اشعار میں جو تازگی پائی جاتی ہے وہ الفاظ کو نئے سیاق میں برتنے کی وجہ سے اور بھی زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بے برگ وخزاں دیدہ درختوں کی خموشی
جیسے کسی بیتے ہوئے موسم کی صدا ہے

گھر سے دن کے ساتھ نکلا تھا کوئی
رات کے جنگل میں جا کر کھو گیا

گھر ہو کہ راستہ ہو اک آسیب ہر جگہ
تنہائیوں کا زہر اگلتا دکھائی دے

چاند نکلا تو کسی یاد نے دستک دی ہے
رنگ بکھرے ہیں تو عکسِ لب ورخسار ہے

ملا کرتا ہوں اکثر دور خوابوں کے جزیرہ میں
نہ جانے کب تمہارا نام لے کے وہ سحر آئے

ooo

خورشید احمد جامؔی کی شعری زبان کی تعریف اُردو کے ہر چھوٹے بڑے ناقد نے کی۔ انہوں نے غزل کو جس نوعیت کا لفظیاتی پیراہن عطا کیا تھا وہ غزل کے جسم پر اتنا فٹ بیٹھا کہ اس کا حسن اور اس کا جوبن اور نکھر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خورشید احمد جامؔی کی شاعری پر گفتگو کرنے والا ہر ناقد ان کی لفظیات ، تراکیب ، استعارہ اور علامت سازی کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ:

''خورشید احمد جامؔی نے جہاں قدیم استعاروں کو نئے تلازموں کے ساتھ برتا ہے وہیں بہت سے نئے استعارے بھی وضع کئے ہیں۔ اس کے اشعار میں وارفتگانِ شوق، دشتِ بے کراں، غمِ روزگار، یادِ جاناں، چراغ منزل جیسی تراکیب کے ساتھ صداؤں کے جنگل، خیالوں کی بھیڑ، دل کی دہلیز، رات کی دیوار، رات کے زینے، خوابوں کے دریچے، خیالوں کی قندیل، یادوں کے مینار، الفاظ کے شیشے، اندھیروں کے بدن، تنہائیوں کی برق، وجود کا صحرا، اجالوں کی زبان، دشت کے زخم، ہجر

کے موسم، اجالوں کے پیامبر، امیدوں کے کھنڈر ایسی استعارہ خیز ترکیبیں ہیں جو نئی شاعری میں خورشید احمد جامی سے پہلے دیدہ وشنیدہ نہیں تھیں۔''

اسی لئے ڈاکٹر محمد حسن نے کہا تھا:

''جدید غزل کے بانیوں میں خورشید احمد جامؔی کو اولیت حاصل ہے۔ نئی لفظیات اور نئی تراکیب کے علاوہ جامی کے یہاں پیکر تراشی کا عمل بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر خورشید احمد جامؔی کی شاعری کو نظر میں رکھ کر استعاروں، تشبیہات، اور نئی نئی تراکیب کی لغت مرتب کی جائے تو اس میں قابل ذکر سرمایہ جمع ہو جائے گا۔''

فاروقی صاحب نے جامی کے استعاراتی اسلوب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''جامؔی کی غزلوں کو دیکھ کر عصریت کا احساس فوراً ہو جاتا ہے۔ جامؔی کا ذہن پیچیدہ نہیں ہے وہ استعارہ سے زیادہ پیکر کی زبان میں بات کرتا ہے اور علامت بھی وہ استعمال کرتا ہے جو داخلی دنیا کے حوالے سے فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔''

اور سچی بات یہ ہے کہ جامؔی کا استعاراتی انداز، پیکر سازی کے عمل اور علامت کے برتنے کے سلیقے سے ہی نکھر کر سامنے آیا ہے۔ ان کے یہاں جو نیا پن پایا جاتا ہے وہ تقلیدی نہیں تخلیقی ہے کیونکہ وہ بذات خود ایک خلاق ذہن کے حامل فنکار اور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری تو کبھی کبھی حسی پیکروں کا عجائب خانہ محسوس ہونے لگتی ہے جبکہ ان کے یہاں شخصی اور غیر شخصی علائم کا بھی اپنا اپنا مقام ہے۔ یہ اشعار دیکھئے

بے برگ وخزاں دیدہ درختوں کی خموشی
جیسے کسی بیتے ہوئے موسم کی صدا ہے

کوئی ہلچل ہے نہ آہٹ نہ صدا ہے کوئی
دل کی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہے کوئی

کوئی کہے تو وقت کے مقتل میں کیا کہے
کس کے لہو سے تر ہے، اجالوں کی آستیں

ہمیں کو مڑ کے نہ دیکھا ہمیں کو کچھ نہ کہا
اس احتیاط سے ہم زندگی کے ساتھ چلے

کچھ دور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں
ممکن ہے راستے میں کہیں زندگی ملے

خوابوں کی تیز دھوپ تو سر سے گذر گئی
اب کیوں کھڑے ہو رات کی دیوار کے تلے

ہم ہیں اپنے وجود کا صحرا
کل بھی تنہا تھے آج بھی تنہا

ooo

اس سرسری مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خورشید احمد جامؔی جدید غزل کی سب سے معتبر اور منفرد آواز ہے۔ ان کی شاعری کا لہجہ کل بھی تازہ تھا اور آج بھی تازہ ہے۔ ان کی غزلوں میں جو نغمگی ہے وہ زندگی کی رگوں کے لہو کی روانی کی دین ہے اور جب تک زندگی کی رگوں میں لہو زندہ رہے گا ان کی غزلیں بھی بہار دکھاتی رہیں گی۔

☆☆☆

انجینئر محمد عادل فراز
ہلال ہاؤس، مکان نمبر ۴/۱۱۴
نگلہ ملاح سول لائن، علی گڑھ، یوپی

غالبؔ کی خطوط نگاری

خطوط نگاری سے انسان کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اس کی ذریعہ انسان اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے اور دوسروں کے حالات سے آشنا ہوتا رہا ہے۔ جب ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے شواہد سامنے آنے لگتے ہیں کہ کس کس دور میں کیسے کیسے خط لکھے گئے اور کن کن شخصیات نے خط و کتاب کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچائی۔ خطوط نگاری اپنے دور کے گرد و پیش کے حالات و واقعات کی بھی عکاسی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں خطوط کے مطالعہ کے بعد بخوبی اس دور کی تاریخ کا علم ہو جاتا ہے جس دور سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ اسی لئے خطوط نگاری کی ہر دور میں اہمیت برقرار رہتی ہے۔

اگر ہم اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے ایسے خطوط مل جاتے ہیں جو اردو ادب کے مختلف ادوار کی تاریخی و لسانی تصویر کشی کرتے ہیں اور جن کو پڑھ کر ہم آسانی سے یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کس دور میں کون سے الفاظ رائج تھے اور کون سے الفاظ متروک تھے کون سے محاورے زبان زدِ خاص و عام تھے اور کس علاقے میں کس زبان اور تہذیب کا اثر زیادہ تھا۔ مثلاً اردو خطوط نگاری کا ایک دور وہ بھی تھا جب ہندوستان میں فارسی زبان کے زیرِ اثر خط و کتابت کا ایک رسمیہ انداز قائم تھا۔ خط لکھنے والا خط کی ابتداء میں تکلفات سے کام لیتا تھا اور لمبے چوڑے القاب و آداب کے بعد نفسِ مضمون پر آتا تھا۔ اس کے علاوہ خطوط مقفا و مسجع عبارت سے پُر ہوتے تھے۔ مقفا و مسجع عبارت کسی نثری فن پارے کے لئے تو مناسب یا عوام و خواص کے لئے جاذب نظر ہو سکتی ہے لیکن خط میں اس کی فروانی سے اصل مقصد مجروح ہوتا تھا۔ لیکن اس سے اس دور کی پُر تکلف گفتگو کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان خصوصاً ادب سے وابستہ شخص اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کس قدر وقت لیتا تھا۔ اصل میں یہ اس دور کی بات ہے جب انسان کے پاس وقت بہت ہوتا تھا اور زمانہ دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا لیکن جب سائنس نے ترقی کی یا ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہندوستان میں رونما ہوا تو خصوصاً ہندوستان کا ماحول و معاشرہ تبدیل ہوا۔ اس دوران ادب نے بھی نیا رُخ اختیار کیا داستان کی جگہ ناول نے لے لی اسی کے ساتھ انسان کی زندگی کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی کے طور طریقے بھی تبدیل ہوئے تو ایسے وقت

میں ضروری تھا کہ خط و کتابت پر بھی اس کا اثر پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اپنے گرد و پیش سے اُردو خطوط نگاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

خطوط نگاری کے رنگ کو تبدیل کرنے میں مرزا اسداللہ غالبؔ کا اہم کردار رہا۔ ان کے جدید ذہن نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے خط و کتابت کے انداز کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے پُر تکلف الفاظ اور رسمی القاب و خطاب سے گریز کرتے ہوئے مکتوب الیہ کو خطاب کیا۔ ان کے خطوط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب سے دور نہیں بلکہ اُس کے پاس بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ''میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے''۔

غالبؔ کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا ان کی شخصیت ایسی تھی جو ان سے ایک بار ملاقات کر لیتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ملک بھر میں ان کے دوست اور شاگرد پھیلے ہوئے تھے جو ان سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ غالبؔ بھی ہر خط کا جواب لکھنا واجب سمجھتے تھے۔ غالبؔ نے جب اُردو میں خط لکھنا شروع کئے تو یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ سرسری طور پر لکھے گئے ان کے خطوط اتنے مقبول ہو جائیں گے کہ ان کے احباب ان کی اشاعت کے لئے کہیں گے۔ غالبؔ کے خطوط کے دو مجموعے ''عودِ ہندی'' اور ''اردوئے معلّٰی'' ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء کے درمیان منظر عام پر آئے جس سے غالبؔ کی خطوط نگاری کی انفرادیت سب پر واضح ہوئی۔

وہ منفرد مزاج کے مالک تھے۔ کسی کے بنائے ہوئے راستے پر چلنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ انھوں نے خود اپنے لئے نئی راہ بنائی اور اس پر تادمِ آخر رواں دواں رہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جہاں شاعری میں اپنی مثال آپ ہیں تو نثر میں بھی خطوط نگاری کے حوالے سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے خطوط نگاری کے فن میں ایسے جوہر دکھائے جن کی مثال اس دور میں دیکھنے کو بہت کم ملتی ہے اور آج بھی ان کی مکتوب نگاری کی دلفریبی اہلِ ادب سے بے پناہ داد و تحسین وصول کرنے میں سب سے آگے ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ شاعری نہ کرتے اور صرف خطوط نگاری سے ہی کام لیتے تو ان کا ادب میں وہی مقام ہوتا جو آج ہے تو قطعی غلط نہ ہوگا۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ غالبؔ کی خط و کتابت کے سلسلے سے اپنی کتاب یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں۔ ''مرزا کی شہرت و ناموری کا دار و مدار ان کی اردو فارسی شاعری پر نہیں اردو مکتوب نگاری پر ہے۔'' غالبؔ کی اسی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا کہنا ہے کہ ''خاکم بہ دہن اگر دیوانِ غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب ہوتے تو بھی غالبؔ غالب ہی ہوتے۔''

غالبؔ کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خط و کتابت میں نہایت ہی سادہ، سلیس اور بے تکلف اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ ان کے لہجہ میں برجستگی، شوخی اور ظرافت کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں جدّت پسندی، تاریخی شواہد،

مختصراً القاب و آداب، سلام و دعا، گفتگو اور بات چیت کا سا اندازِ فکر، ڈرامائی رنگ و آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

غالبؔ اپنے خطوط میں الگ الگ موقع کی مناسبت سے طرزِ تحریر اختیار کرتے ہیں۔ان کے تعزیتی خطوط کا رنگ الگ اور خوشی اور مبارک باد کے موقع پر لکھے گئے خطوط کا رنگ الگ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی روداد اور سوانح بھی تحریر کردی ہے اور اپنے دور کے حالات بھی رقم کردئے ہیں۔ان کے خطوط اس دور کی دلّی کی کہانی بھی بیان کرتے ہیں اور عوام الناس کی کشمکشِ حیات کا تذکرہ بھی ان میں پایا جاتا ہے۔اور یہ سب اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ان کے خطوط کا قاری خود کو اس دور کے ماحول سے خود کو نہ صرف آشنا سمجھتا ہے بلکہ اُسے لگتا ہے کہ وہ اس دور کا ایک باشندہ ہے جہاں غالبؔ جیسا شاعر اپنی زندگی کے لمحات صرف کر رہا ہے۔ان کے بارے میں حالیؔ کا ''یادگارِ غالبؔ'' میں مزید بیان ہے کہ ''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہوسکی''۔حالیؔ کے اس بیان کی روشنی میں غالبؔ کی خطوط کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔اور بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو کس بیش قیمتی سرمائے سے نوازا ہے۔ان کی خطوط نگاری کی صلاحیت، کمال اور حسن اس خط میں دیکھے جاسکتے ہیں جو انہوں نے منشی شیونرائن آرامؔ کے لئے تحریر کیا تھا۔لکھتے ہیں کہ ''بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔خیر دیر سے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے''

مرزا تفتہؔ سے بھی ان کا اندازِ مراسلہ دیکھئے لکھتے ہیں:

''کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہوجاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کی ڈاک میں نہ جائے۔''

میر مہدی مجروحؔ سے کچھ اس طرح خط و کتابت کرتے ہیں''او میاں سید زادہ آزادہ' دلی کے عاشق دلدادہ' ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم''ان خطوط کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ اپنے اقارب سے کس بے باکانہ انداز میں کلام کرتے تھے۔جسے وہ خط و کتابت میں بھی اپنا شیوہ قرار دیتے ہیں۔

غالبؔ نے پرتکلف، طویل اور پرتصنع القاب کو ہٹا کر خطوط نگاری کو ایک فطری ذہن عطا کیا۔انھوں نے القاب و آداب اور فرسودہ اندازِ تحریر کو مختصر کردیا۔''یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوندکریم سے مطلوب ہے'' جیسے روایتی جملوں سے انھوں نے گریز کیا۔ان کے خطوط میں مکتوب الیہ کے لئے جو مختصر القاب یا خطاب ہیں وہ اس طرح ہیں مثلاً 'اجی مولانا علائی'، 'مرزا علائی'، 'میری جان'، 'صاحب'، 'مرزا'، 'میاں'، 'سعادت و اقبال نشاں'، 'یار بھتیجے'، 'بھائی مولانا علائی'، 'مہاراج'، 'سید صاحب'، 'فرزندِ دلبند'، 'برخوردار'، 'بھائی'، 'نور

چشم‘، ’راحتِ جان‘، ’پیر و مرشد‘، ’جنابِ عالی‘، ’قبلہ و کعبہ‘، ’قبلۂ حاجات‘، ’خداوندِ نعمت‘ وغیرہ وغیرہ۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ دوستوں، بزرگوں اور بچوں کے القاب وخطابات میں امتیاز رکھتے ہیں اور ان کے یہاں ہر سن و سال یا دوستوں اور اقارب سے متعلق القاب وآداب اُسی اعتبار سے آتے ہیں جس کا مکتوب الیہ مستحق ہوتا ہے۔

ان کے خطوط میں کہیں کہیں ایک ڈرامائی انداز بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ ’’مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصل کے مزے لیا کرو۔‘‘

ان کمال یہ بھی ہے کہ وہ جس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کی جزیات بھی بیان کرتے ہیں لیکن کمال یہ ہوتا ہے کہ تحریر میں کہیں جھول یا بدمزگی واقع نہیں ہوتی بلکہ تحریر دلچسپ اور پُر لطف ہو جاتی ہے۔وہ خط لکھت وقت تاریخ اور دن اور وقت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔مثلاً میر مہدی مجروح کے نام لکھا خط دیکھیں‘ لکھتے ہیں’’آج یک شنبہ کا دن، ساتویں فروری ۱۸۵۷ء کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کی ہے‘‘۔کچھ خطوط میں وقت بھی لکھتے ہیں۔’’منگل کا دن ۲۳/ جمادی الثانی ۱۶/ دسمبر پہر دن چڑھے۔‘‘’’۶/ دسمبر ۱۸۶۵ کہ بدھ کا دن ہے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔‘‘اس کے ساتھ ساتھ کچھ خطوط میں ایسی بھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس میں وہ خط ملنے اور خط لکھنے کے اوقات کو بھی ایک ساتھ تحریر کر دیتے ہیں مثلاً اس طرح لکھتے ہیں۔’’آج دوشنبہ ۶/ رمضان کی اور ۱۵/ فروری کی ہے۔اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا، ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھا۔‘‘ کچھ خطوط میں مختصراً اس طرح تحریر کرتے ہیں۔’’وقتِ ورودِ خط، وقتِ رسیدنِ خط‘‘ غالبؔ کے مزاج میں شوخی وظرافت بلا کی تھی یہی سبب ہے کہ حالیؔ ان کو حیوانِ ظریف کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے خطوط میں شوخی وظرافت کی مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔وہ اکثر چٹکلے، لطیفے، اور ظرافت سے لبریز باتوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان کے دوست ان کے خطوط کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ غالبؔ جب اپنے تعزیتی خطوط تحریر کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کا ایک الگ انداز ابھر کر سامنے آتا ہے۔ایک مقام پر لکھتے ہیں’’کہ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔‘‘ کہیں تحریر کرتے ہیں’’ہائے اتنے دوست مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔‘‘

الغرض غالبؔ کے خطوط میں وہ تمام تر خوبیاں نظر آتی ہیں جو ایک اعلیٰ اردو نثری فن پارے کی خصوصیات کہی جاسکتی ہیں۔انھوں نے خطوط نگاری کا جو طرز ایجاد کیا اس کی مثال ممکن نہیں ان کے بعد ان کی طرزِ تحریر کا انداز تو کسی حد تک اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا جواب نہیں پیدا کیا جاسکتا۔کسی شاعر کا کہنا ہے:

پرواز کرتے رہئے جہاں تک اُڑان ہے
غالبؔ کا فن ہمارے لئے آسمان ہے

☆☆☆

مریم فاطمہ
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو
تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد (تلنگانہ)

بھوپال میں غالبؔ کے ایک خط کی دریافت

مرزا غالب (1797-1869) اردو کے عظیم شاعر گذرے ہیں۔ غالب ایک ہمہ گیر اور جدت پسند شخصیت کے حامل تھے۔ وہ مغلیہ دور کی ثقافت کی عظیم یادگار ہیں۔ غالب نے اپنی جدت پسند شخصیت سے اپنی شاعری اور نثر نگاری میں منفرد انداز قائم کیا۔ ان کے مختصر اردو دیوان نے انہیں شاعری کی دنیا میں عالمی شہرت دلائی تو وہیں نثر میں اپنی منفرد مکتوب نگاری کے وہ امام قرار پائے۔ انہوں نے اپنے مکاتیب میں اندازِ بیان کی خوبی پر توجہ دی۔ غالب نے اس طرح خط لکھے کہ ''آدھی نہیں پوری بات کا مزا لیا جائے''۔ انھوں نے وہ انداز ایجاد کیا کہ'' مراسلے کو مکالمہ بنادیا''۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے تو بھی اُردو ادب میں غالب کا وہی مقام ہوتا ہے جو آج ان کا ہے۔ خطوط غالب کے دو مجموعے (۱) اُردوئے معلیٰ (۲) عودِ ہندی ہیں جو اُردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ غالب کے خطوط کا تیسرا مجموعہ ''مکاتیب غالب'' کے نام سے امتیاز علی عرشی رام پوری نے مرتب کیا۔ جس میں صرف نوابان رام پور کے خطوط ہیں۔ چوتھے مجموعے میں صرف منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام خطوط ہیں۔ غالب کی یہ عادت تھی کہ انہیں جو بھی خط لکھتا تھا وہ اس کا جواب دیتے تھے۔ لوگ اکثر ان سے کلام کے اصلاح کے ضمن میں خط لکھا کرتے تھے۔ غالب 1850ء تک فارسی میں خط لکھا کرتے تھے' اس سال بہادر شاہ ظفر نے انہیں تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ غالب محنت سے فارسی میں لکھا کرتے تھے پھر فارسی میں خط لکھنا انہیں بار گزرا تو انہوں نے اردو میں خط و کتابت شروع کردی۔ پھر غدر کے بعد 1861ء سے ارادہ کرلیا کہ اب اردو میں ہی خط لکھا کریں گے۔ اس لئے انہوں نے تادم زیست اردو میں ہی مکتوب نگاری کی۔ خطوط غالب میں اسلوب بیان کی انفرادیت سے قطع نظر تحقیقی اعتبار سے بھی اہمیت رہی ہے۔ خطوط غالب کو موجودہ دور کے محقق خلیق انجم نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔ مقداری اعتبار سے خطوط غالب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

''جتنے خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں اور تین چار مجموعوں میں شائع ہوچکے ہیں ان کی ضخامت تقریبا 900 صفحات ہے اور تعداد خطوط تقریباً 825۔ اگر چہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوا کرتا لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یعنی غالب کی مستقل تصنیف کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ خاص کر جب ان میں سے تخمیناً سو خطوط کو چھوڑ کر باقی سب غالب کی ایجاد کردہ طرز تحریر ہے یا ان کی شوخی و ظرافت ہے یا ادبی نکات ہیں یا علمی

مباحثہ ہے یا اشعار کی تشریح ہے یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحات ہیں''۔[1]

غالب کے خطوط کے تعلق سے تحقیق بعد کے دور میں بھی جاری رہی۔اور جن لوگوں کے ہاں قدیم تحریروں کا سرمایہ ہے وہ بعد تحقیق سامنے آتا رہا۔غالب کے خطوط کی بازیافت کے سلسلے میں اکثر محققین نے اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ایسی ہی ایک تحقیق بھوپال میں غالب کے خطوط کی دستیابی کے تعلق سے وہاں کے ایک نامور محقق اور ماہر اقبالیات پروفیسر آفاق احمد نے بھی پیش کی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد (1932-2016) بھوپال سے تعلق رکھنے والے مشہور ماہر اقبالیات گزرے ہیں۔وہ ایک نامور محقق، نقاد، افسانہ نگار، شاعر، ادیب، صحافی، ماہر اقبالیات، اردو کی اہم کتابوں کے مرتب اور اردو طلبا کے ہردلعزیز استاد گذرے ہیں۔ان کے تحقیقی مضامین کی ایک کتاب ''امانت قلب و نظر'' ہے جس میں شامل ایک مضمون ''غالب کے نو دریافت خطوط'' ہے۔ یہ ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں پروفیسر آفاق احمد نے ان کی جانب سے بھوپال میں دریافت کردہ غالب کے دو نادر خطوط کی تحقیق کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ خطوط کے ملنے کی تفصیلات سے قبل انہوں نے غالب کے کلام کے اس مخطوطہ کا ذکر کیا جو نسخہ بھوپال کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نسخہ خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔اور اس نے نسخہ حمیدیہ کی اولیت کو ختم کر دیا تھا۔اس تفصیل کے بعد پروفیسر آفاق احمد نے انہیں دریافت ہونے والے غالب کے خطوط کی بازیافت کی تفصیلات پیش کی ہیں۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس دریافت کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔دراصل جب نسخہ بھوپال اول یہاں دریافت ہوا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے نانہال میں پرانے کاغذات اور کتابوں کے ذخیروں کو کھنگالا جائے۔ممکن ہے اس تلاش سے کوئی در بے بہا ہاتھ لگ جائے۔اس وقت میرے سامنے جناب نادم سیتاپوری کی ایک تحریر بھی تھی جس میں انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ ابوالفضل دوراں مرزا محمد عباس رفعت شیروانی کے نام کم از کم دو تین درجن خطوط غیر مطبوعہ رفعت کی وفات ۱۲۱۶ھ تک اس خاندان میں موجود تھے۔اس کے علاوہ نادم سیتاپوری نے میرے مرحوم نانا سید علی نقی صاحب کا یہ بیان بھی نقل کیا تھا کہ دادا جان کی وفات کے بعد جب ان کا ترکہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوا تو کتابوں اور اثاث البیت کی طرح غالب کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی اس تقسیم میں آ گئے جن کا کچھ حصہ تلف ہو گیا اور نوادرات کا کافی ذخیرہ حیدرآباد دکن پہنچ گیا۔جن میں غالب کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل تھے۔اب وہ کس کے قبضے میں ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔میں نے اپنے محترم نانا سید علی نقی صاحب مرحوم کی کتابوں، پرانے کاغذات اور جس الماری میں یہ ذخیرہ موجود تھا اس کا ایک ایک کونہ چھان مارا مگر دوسری بہت سی بیش بہا تحریریں اور کتب تو ملیں جن سے مولانا عباس رفعت کی حیات کے بہت سے نئے گوشوں کا پتہ چلا لیکن غالب کی کوئی تحریر ہاتھ نہیں آئی۔ یہاں سے مایوس ہو کر میں نے اب اپنی تلاش کا مرکز نانہال کے دوسرے گھر یمنی منزل کو بنایا۔صوبے دار میجر رضا میاں کے ساتھ پھر پرانے ذخیرے کو کھنگالنا شروع کیا چچا

میاں بار بار یہ کہتے تھے کہ ہیں ضرور کسی رجسٹر یا کتاب میں ہیں۔ میں نے دیکھے ہیں وغیرہ لیکن کہاں تھے ملنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ایک دن میری والدہ میجر صاحب کے گھر گئیں۔اور واپس آئیں تو یہ مژدہ ساتھ لائیں کہ غالب کے خطوط مل گئے ہیں۔ اور چچا میاں نے تمہیں بلایا ہے۔میں حیرت اور خوشی کے جذبات سے سرشار ہوگیا بالآخر وہ متاع بیش بہا مل ہی گئی۔ بھاگا بھاگا چچا میاں کے یہاں پہنچا۔میرے سامنے ایک رجسٹر تھا جس میں غالب کے تین خطوط بھی چسپاں تھے۔دو اردو میں ایک فارسی میں۔بار بار ان کی زیارت سے آنکھوں کو نور عطا کرتا رہا۔۔۔رجسٹر کو جگہ جگہ سے دیمک نے کھایا ہوا تھا۔میں سوچتا ہوں غالب صدی کے دوران غالب کی تحریر کے ایک ایک لفظ کی نہ یوں تلاش ہوتی اور نہ یہ فراموش کئے ہوئے اوراق سامنے آتے۔ورنہ ان کا مقدر بھی دیمک کی غذا بن گیا ہو''۔ ۲

اس تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر آفاق احمد قدیم مخطوطات اور متون کی تلاش میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور ایک سچے محقق کی طرح انہوں نے بڑے صبر اور جستجو سے غالب کے ان گم شدہ خطوط کی بازیافت کی۔اپنے اس مضمون میں آگے پروفیسر آفاق احمد نے مولانا عباس رفعت کا تعارف بیان کیا کہ وہ بھوپال سے تعلق رکھتے تھے۔اور دہلی دربار تک ان کی رسائی تھی۔غالب سے اپنے کلام کی اصلاح لی۔اور اس تعلق کی بنا غالب نے انہیں خطوط لکھے تھے۔پروفیسر آفاق احمد نے مولانا عباس رفعت کے نام غالب کے لکھے خط کا متن شامل کیا ہے۔ یہ خط 4 نومبر 1871ء کو لکھا گیا تھا۔غالب لکھتے ہیں:

''پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آجاتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہوجاتا ہوں۔اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنے بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم۔مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔انگریز قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ایک عزیز پر ستم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ۳

مضمون میں پروفیسر آفاق احمد نے غالب کے اس خط سے متعلق مزید تحقیق بھی پیش کی کہ کلیات نثر غالب میں جو خط شائع ہوا تھا اور انہیں جو خط دستیاب ہوا تھا اس میں اختلافات پائے گئے تھے۔یہ اختلافات خط کی بار بار نقل کے دوران شامل ہوئے۔پروفیسر آفاق احمد نے ایک منجھے ہوئے محقق کی طرح اس خط کی ابتدا سے انتہا تک تمام مراحل کے مختلف حوالوں سے پیش کیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے میدان میں کس قدر تجربہ کار تھے۔غالب کے خطوط کی یہ تحقیق مزید تحقیق کی راہیں کھولتی ہیں کہ جن جن احباب کو غالب نے جو خطوط لکھے تھے ان میں سے چند ایک اب بھی گوشہ گمنامی سے سامنے آرہے ہیں اور ان خطوط سے ہمیں غالب کی بازیافت میں مدد ملتی ہے۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم نازؔ

''من سمجھاون'' پروفیسر عبدالستّار دلوی کی نظر میں

من سمجھاون صوفی بزرگ وشاعر شاہ تراب چشتی کی دکنی نظم ہے جوانھوں نے مراٹھی کوی رام داس کی مناچے شلوک سے متاثر ہوکر کہی ہے جس کو پروفیسر عبدالستّار دلوی نے اپنے طویل ومبسوط مقدمے کے ساتھ 1965ء میں اُردو مرکز ڈائمنڈ لاج ،ممبئی سے شائع کیا ہے اور اس کی ضخامت 90 صفحات ہیں۔

من سمجھاون کی ابتداء پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈائرکٹر انجمن اسلام' اُردو ریسرچ انسی ٹیوٹ کے پیش لفظ سے ہوتی ہے جو پروفیسر عبدالستّار دلوی کے لیے پیرمغاں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔کیوں کہ آپ نے ایک طویل عرصہ پروفیسر ندوی کی شاگردی وصحبت میں گذارا ہے اور اس طویل عرصے میں پروفیسر ندوی نے ہمیشہ نہ صرف آپ کی حوصلہ افزائی کی بلکہ تحقیقی شعبے میں پیشرفت کی تلقین کرتے رہے۔جس کا نتیجہ من سمجھاون کی شکل میں ظاہر ہوا۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اپنے پیش لفظ میں بھکتی تحریک ، جین مت، بدھ مت، تجدید برہمنیت، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، صوفیائے کرام کی انسان دوستی اورواحدۃ الوجود کے فلسفے پر گفتگو کرتے کرتے مہارشی رام داس کی مناچے شلوک تک کا احاطہ کیا ہے اور آگے یہ بھی بتاتے ہیں کہ دس سال قبل خود ان کی ملکیت میں من سمجھاون کا نسخہ تھا جس کو انھوں نے ترتیب وتدوین کی غرض سے اپنے دوست ڈاکٹر دیورے کے سپرد کیا تھا لیکن ڈاکٹر دیورے کی اچانک موت سے یہ امر حقیقت نہ بن سکا۔ لیکن اپنے شاگردِ خاص کی اس پہل پر وہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

من سمجھاون میں پیش لفظ کے بعد پروفیسر عبدالستّار دلوی کے قلم سے نکلا ہوا دیباچہ ہے جس کی ابتداء وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاہ تراب کی نظم ''من سمجھاون'' میرے علم میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہورہی ہے۔من سمجھاون کی ترتیب کا خیال دو سال قبل میرے ذہن میں تھا مگر اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے میں اسے اب تک مرتب نہیں کرسکا۔موجودہ ترتیب سے بھی میں کچھ بہت زیادہ خوش نہیں ہوں اور اس کی بڑی وجہ اس کے دیگر قلمی نسخوں کا ہمدست نہ ہونا ہے۔گوکہ میں نے امکان بھر کوشش کی تھی کہ میں خود دیگر نسخے بھی دیکھ لوں تاکہ ان کا بمبئی کے زیرنظر نسخہ

سے مقابلہ کیا جا سکے۔ اب بھی میں یہی سوچ رہا ہوں کہ دیگر نسخوں سے مقابلہ کئے بغیر میں اسے شائع نہ کروں لیکن اس نظم کا موضوع اور مراٹھی سے اس کے تعلق نے اس قدر رجھایا ہے کہ اب طباعت میں تاخیر منظور نہ ہوئی۔'' (من سمجھاون، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص۔ 9)

دیباچے میں اپنے اس اعتراف کے بعد وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت کتاب کی تمام خامیوں کو دور کیا جائے گا۔

کتاب میں پیش لفظ اور دیباچے کے بعد کی منزل مقدمہ ہے۔ جو کہ کم وبیش 40 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی طویل تمہید میں آپ نے ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام، ہندوؤں پر اسلامی تہذیب کے اثرات، نو وارد مسلمانوں کے مذہبی جذبات، ان کی انسان دوستی، بھائی چارگی اور ہندوستانیوں سے ان کی پُرخلوص رواداری کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے جو سیاسی، سماجی، تاریخی، تنقیدی، لسانی اور تقابلی ہر اعتبار سے مفید ہے۔

مقدمے میں آپ نے مہاراشٹرا میں مسلم صوفیا کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد مراٹھی کے مشہور شعراء گیانیشور، ایکناتھ، تکا رام اور نام دیو کے ساتھ ساتھ رام داس جو کے مناچے شلوک کے شاعر ہیں کی حیات وتعلیمات پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی کے مطابق رام داس کا اصلی نام نارائن ہے اور وہ 1608ء میں جامبھ گاؤں جلگاوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سریاجی پنت اور ماں کا نام رانو بائی تھا۔ رام داس اپنے بھائی گنگا دھر عرف رامی رام داس سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے۔ ان کے والد نے بڑے بیٹے رامی رام داس کو منتر سکھانے کا ارادہ کیا اور یہ اطلاع جب رام داس کو ہوئی تو انھوں نے بھی منتر سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر عمر کی کمی کے سبب ان کی اس خواہش کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں رام داس نے غصے میں گھر چھوڑ دیا۔ اس کے برخلاف پروفیسر سیدہ جعفر رام داس کے گھر چھوڑنے کی دوسری دو وجوہات پیش کرتی ہیں-

''جب ان کی عمر بارہ سال تھی وہ گھر سے بھاگ کر ناسک کے قریب تکالی کے قصبے میں پہنچے۔ اس واقعے کی ایک یہ بھی وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کی والدہ شادی کر کے انھیں گھر ہستی کے بندھن میں باندھ دینا چاہتی تھیں اور اس سے گھبرا کر وہ بھاگ نکلے تھے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رام داس کے بھائی گنگا دھر انھیں روحانیت کے طرف راغب ہونے سے منع کرتے تھے کیوں کہ ابھی ان کی عمر صرف بارہ سال ہی تھی۔'' (من سمجھاون، مرتبہ پروفیسر سیدہ جعفر، ص۔ 116)

اسی تعلق سے ڈاکٹر جمال شریف لکھتے ہیں:

''رام داس کی شادی بارہ سال کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے وقت (پنڈت کے منھ سے نکلا ہوا) ایک لفظ ''سلّو دھان'' سن کر بھاگ گئے۔'' (دکن میں اُردو شاعری

وَلی سے پہلے:ص۔793)

رام داس کے گھر چھوڑنے سے متعلق پروفیسر عبدالستّار دلوی، پرفیسر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر جمال شریف کی مختلف آراء میں پروفیسر عبدالستّار دلوی کی رائے کو ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے مقدمہ میں آگے بیوی، بچوں سے متعلق رام داس کی سوچ کو یوں بیان کیا ہے:

''عام طور سے سادھوں اور سنتوں نے خاندانی زندگی اور بیوی بچوں سے بیزاری ظاہر کی ہے۔لیکن رام داس اس ضمن میں مہاراشٹرا کا وہ ممتاز سادھو ہے جس نے اس منفی نظریہ حیات کی سخت مخالفت کی اور اسے اثباتی رنگ وآہنگ عطاء کیا۔''(من سمجھاون،مرتبہ پروفیسر عبد الستّار دلوی،ص۔26)

چوں کہ پروفیسر عبدالستّار دلوی کی دونوں آراء ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتی ہیں اور پروفیسر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر جمال شریف دونوں کی آراء رام داس کی زندگی میں آگے پیش آنے والے واقعات سے میل نہیں کھاتیں۔اسی لیے ان کو ماننا مشکل نظر آتا ہے۔

بقول پروفیسر عبدالستّار دلوی رام داس نے گھر چھوڑنے کے بعد ٹاکلی گاؤں پنچوٹی کے رام مندر میں بارہ سال عبادت کی۔اسی دوران ایک دن شری رام نے ان کو درشن دیئے جس کے بعد انھوں نے پورے ملک کی تیرتھ یاترا کی۔اسی یاترا کے دوران رام داس نے مذہبی گرہوں کی مذہب اور زندگی سے دوری کو مذہب اور سماج کے حق میں خطرہ محسوس کیا۔جس کے چلتے انھوں نے ملک بھر میں کئی مٹھ قائم کیے جہاں پر ان کے چیلوں نے ان کی تعلیمات کو عام کیا اور ان کے چیلوں میں اودھوگوسوامی' کلیان سوامی، اننت کوی بھیم سوامی، ستیو باسوامی اور کیشو داس سوامی قابل ذکر ہیں۔ نیز اس سلسلے میں شیواجی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ رام داس کے عظیم مہاراشٹرا کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے والی شخصیت شیواجی ہی کی تھی۔ان کی زندگی کا آخری وقت سجن گڑھ کے قلعے میں گذرا جہاں ان سے ملنے آنے والے عقیدت مندوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ وہیں 1681ء میں ان کی وفات ہوئی۔

پروفیسر عبد الستّار دلوی اپنے مقدمے میں رام داس اور ان کی تعلیمات کو بیان کرنے کے بعد رام داس کی تصانیف اور ان میں مناچے شلوک کا خصوصی ذکر کر کے کہتے ہیں کہ شاہ تراب کی صراحت کے مطابق من سمجھاون رام داس کی پوتھی کا جواب ہے جس میں انھوں نے اس کے سب رمز کھولے ہیں ۔

ای اس کی من کی پوتھی کا جواب ہے
کہ جس کا رام داس جگ میں خطاب ہے
مراٹھی بات میں پوتھی وہ بولیا
میں اس کا رمز سب دکھنی میں کھولیا
بھی اس کا نام من سمجھاون ہے راکھا
لیکن سر بسر ہندی ہے بھاکا

ooo

پروفیسر عبد الستّار دلوی مقدمے میں اب اس

موقع پر من سمجھاون کے شاعر شاہ تراب کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر تفصیلی انداز میں گفتگو کرتے ہیں ۔ان کے مطابق تراؔب کی پیدائش 1100ھ کے ربیع الآخر یا بارھویں صدی کے ربیع الاوّل میں ہوئی ہوگی۔اس لیے کہ شاہ تراؔب کی ایک نظم ''گیان سروپ'' کی کتابت جس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد میں محفوظ ہے جس میں انھوں نے اپنے تئیں بالک بالا لکھا ہے۔اگر کتابت کی طرح اسی کو سنہ تصنیف بھی مان لیا جائے تو بالک بالا کے پیش نظر ان کی پیدائش کا زمانہ 1100ھ کے قریب ہی ہوگا۔ پروفیسر سیدہ جعفر بھی اس ضمن میں کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتی ہیں:

پروفیسر عبدالستّار دلوی اور پروفیسر سیدہ جعفر شاہ تراؔب کی نظم ''گیان سروپ'' کے مخطوطے کی کتابت کی بناء پر کہتے ہیں کہ شاہ تراب کا سنہ پیدائش 1100ھ یا اس کے آس پاس ہوگا مگر ڈاکٹر جمیل جالبی ان قیاس آرائیوں کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاہ تراب نے اپنے دیوان میں ایسے اشارے کیے ہیں جن سے ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔شاہ تراب نے ایک غزل میں بتایا کہ ترتیب وفکر دیوان کے وقت ان کی عمر 40 سال تھی۔ یہ دیوان ایک سال میں مکمل ہوا اور اس وقت سنہ 1170ھ اور 57 تا 1756ء تھا۔''گل خورشید''اس کا مادۂ تاریخ ہے.....اسی حساب سے ان کا سال پیدائش 1130ھ ہوتا ہے۔اسی سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ''گیان سروپ'' کے جس نسخے پر سنہ کتابت 1121ھ 1709ء درج ہے۔ وہ محض کتابت کی غلطی ہے۔''(تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، ص۔243 تا245)

پروفیسر عبدالستّار دلوی اور پروفیسر سیدہ جعفر دونوں کی تاریخ پیدائش کے مقابلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ پروفیسر عبدالستّار دلوی اور سیدہ جعفر کے قیاس کی بنیاد تراؔب کی نظم ''گیان سروپ'' کا وہ مخطوطہ ہے جو کاتب کا لکھا ہوا ہے۔شاہ تراؔب کا قلمی نسخہ نہیں۔اس کے برخلاف ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ تراؔب کے جس دیوان کا ذکر کر رہے ہیں وہ دنیا میں دیوان تراؔب کا واحد معلوم قلمی نسخہ ہے۔

پروفیسر عبدالستّار دلوی نے اپنے مقدمے میں آگے بتایا ہے کہ شاہ تراب، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ اور پیر بادشاہ حسینی کے سلسلے میں مرید تھے اور تراؔب کے مرشد پیر بادشاہ حسینی نے ان کے علم وعمل سے متاثر ہوکر 1150ھ میں انھیں اپنا خلیفہ مقرر کرکے رشد وہدایت کے لیے ترنامل روانہ کیا۔اس پورے واقعے کا ذکر تراؔب نے اپنی مثنوی ''ظہور کلی'' میں کیا ہے اور آپ خلافت ملنے کے بعد ''گنج الاسرار'' کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔

مقدمہ نگار پروفیسر عبدالستّار دلوی کے مطابق تراؔب کی پانچ تصانیف ہیں۔ گیان سروپ، من سمجھاون، ظہور کلی، گلزار وحدت اور گنج الاسرار۔اور اس سلسلے میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''ان کے علاوہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون ''شاہ تراب چشتی''مطبوعہ آجکل ،ستمبر 1963ء میں تراب کی غزلوں کے علاوہ رسالہ تصوف مثنوی مہ جبیں و ملا اور آئینہ کثرت کا حوالہ بھی دیا ہے جو میرے علم میں نہیں تھیں۔''
(من سمجھاون، مرتبہ پروفیسر عبدالستّار دلوی،ص۔33)

تراب خلافت ملنے کے بعد رشد وہدایت کی غرض سے تنجور گئے ۔ وہاں انھوں نے رام داس کی فاضل پوتھی کا ذکر سنا تو انھیں اس کا جواب لکھنے کا شوق ہوا۔

تجاور میں جس دن ہوا آکے داخل
سنیا رام داس کی تو پوتھی ہے فاضل
گیا سُن خوشی ستیں دل کا کنول کھول
جواب اس کا کہنے ہوا شوق کامل

پروفیسر عبدالستّار دلوی نے آگے چل کر مقدمے میں مناچے شلوک کی اہمیت بتاتے ہوئے اس کے کچھ شلوک اوران کا مطلب آسانی سے سمجھا دیا ہے۔جس کے بعد وہ من سمجھاون کی طرف آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس نظم کا موضوع تصوف و اخلاق ہے اور انداز بیانیہ ہے' نظم گیارہ حصوں میں منقسم ہے' ترجیع بند کی ہئیت میں ہے ،نظم کے ابتدائی حصے میں واحدۃ الوجود کو پیش کرنے کے بعد شاعر دوسرے حصے میں انسانی کمزریوں ، دنیا داری مثلاً اختلافات،حرس وہوس،دنیا کی بے ثباتی،ظاہرداری اورخود پرستی سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے اوراس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا کی ذات تک پہنچنے کے لیے سچے رہبر اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر رہنما کے اپنی منزل مقصود (معرفت باری تعالیٰ) تک پہنچنا محال ہے۔اس کے بعد انھوں نے نظم کے کچھ بند کو مطلب بتاتے ہوئے سمجھایا ہے۔ اس کے علاوہ مناچے شلوک اورمن سمجھاون کے کچھ اشعار کی تقطیع بھی کر کے دکھائی ہے۔جس کا مقصد مراٹھی اور دکنی دونوں نظموں کی بحر کی یکسانیت کو دکھانا ہے۔

پروفیسر عبد الستّار دلوی مقدمے کے آگے کے مرحلے میں نظم من سمجھاون کی لسانی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ان کے خیال میں من سمجھاون کی زبان قریب دو سوسال پرانی ہے اوراس پر ہریانوی و پنجابی زبانوں کا اثر موجود ہے۔نیز اس میں بھی دیگر دکنی تصانیف کی طرح اکثر و بیشتر ایسے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں جواب متروک ہیں۔تذکر وتانیث،جمع بنانے کے قاعدے،ضمائر،حروف ربط اور افعال وغیرہ تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے قطب مشتری ،سب رس،گلشن عشق، من لگن، طوطی نامہ وغیرہ دیگر تصانیف میں پائے جاتے ہیں ۔مقدمے کے آخری حصے میں مخطوطے کی املائی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ یہ مخطوطہ جس سے پروفیسر عبدالستّار دلوی نے استفادہ کیا ہے وہ کتب خانہ مدرسہ جامع مسجد،بمبئی میں محفوظ ہے اور رموز الکابین 'دیوان علیم اللہ اور پنچھی باجا کے ساتھ مجلد ہے۔اس کے کاتب عظیم الدین ہیں۔اس مخطوطے کی املائی خصوصیات یہ ہیں:

کاف اور گاف دونوں پر ایک ہی مرکز ہے کوئی امتیاز نہیں ہے۔
جب بھی کاف اور گاف کسی لفظ کے آخر میں ''چ'' کے ساتھ آئے ہیں تو اس کے ساتھ ''ہ'' بھی بڑھا دی گئی ہے۔
یائے معروف اور ہائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہائے ہوز کی مختلف شکلوں کو بغیر کسی فرق کے تحریر کیا گیا ہے۔
حرف نفی ''نہ'' کو اکثر بعد کے لفظ سے جوڑ کر لکھا گیا ہے۔
''ڑ'' کے لیے کوئی امتیازی علامت نہیں ہے اور وہ ''ر'' کی طرح لکھی گئی ہے۔ جیسے: گھوڑا کو گھورا۔
''ٹ'' پر ''ط'' کے بجائے چار نقطے ہیں۔

پروفیسر عبد الستّار دلوی مقدمے کے آخر میں من سمجھاون پر بحیثیت مجموعی اس طرح اپنی رائے دیتے ہیں:

''شاہ تراب نے مراٹھی تصنیف اور اس کی تمام جزیات کو اسلامی تصوف کے سہارے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ہندو دیومالا کے ناگریز حوالہ جات کو اپنی اس نظم میں جگہ دے کر اسلامی تصوف کی ہمہ گیری اور اپنی وسیع المشربی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ شاہ تراب کی یہ ادبی کوشش اُردو زبان وادب کی ابتدائی دور میں موجود قومی یکجہتی کا عملی ثبوت پیش کرتی ہیں۔'' (من سمجھاون، مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص۔50)

پروفیسر عبدالستّار دلوی کے طویل و پُر مغز مقدمے کے بغور مطالعے کے بعد شاہ تراب کی من سمجھاون کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیوں کہ فاضل مقدمہ نگار نے اپنے سیر حاصل مقدمے میں اس قدیم دکنی نظم سے متعلقہ تمام پہلوؤں جیسے نظم کے شاعر کے حالاتِ زندگی، تصانیف، نظم کی اہمیت، اس کے موضوع اور بحر، املائی خصوصیات، لسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ مراٹھی میں اس نظم کے شاعر رام داس اور ان کی تعلیمات و نظم منا چے شلوک تک سب کا احاطہ کیا ہے۔

☆☆☆

مولانا آزاد کا سحر زبان و قلم

''بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان اور اسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اسے اپنے ہاتھ سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہیے۔ اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے۔ وہ زمانوں کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کروں''۔

(تذکرہ: مولانا آزاد)

''وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے۔ اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا، بصیرت و معرفت کا درس تھا، ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا''۔

(مولانا آزاد)

جرار احمد
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد-32

میراں جی خدانما کی نثری خدمات

سید میراں جی خدانما دکن کے ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ان کا تعلق مشہور ومعروف صوفی حضرت بندہ نواز گیسودراز سے تھا، جو کہ سلسلہ چشتیہ کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ تھے۔معتقدین نے آپ کے تقدس سے متاثر ہوکر آپ کو خدانما کا لقب دیا تھا۔میراں جی سید تھے اور میراںؔ تخلص اختیار کیا تھا۔آپ کے خلیفہ میراں یعقوب کی کتاب ''شمائل الاتقیا'' کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ 1004ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ میراجی خدانما کو مندرجہ ذیل مختلف ناموں سے بھی جانا جاتا ہے:

۱۔ شاہ میراں جی سید حسن خدانما
۲۔ شاہ میراں جی خدانما
۳۔ میراں جی کا روانی الیاس میراں جی خدانما
۴۔ سید شاہ میراں جی حسین خدانما
۵۔ سید میراں خدانما حسینی

شاہ میراں جی نے اپنی شاعری میں اپنا نام ''میراں'' اور ''سید میراں'' ذکر کیا ہے۔

سلوک کی تمام منازل کو طے کرنے کے بعد میراں جی حیدرآباد آئے اور اپنے مقصد بنی نوع انساں کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی شروعات کی۔بنی نوع انسان کی ہر طرح سے بھلائی چاہنے والے اس بزرگ نے جب ہر طرح سے لوگوں کی بھلائی کے فریضہ کو انجام دینا شروع کیا اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہوئے اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کا پیغام دینا شروع کیا تو ''خدانما'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔

شاہ میراں جی کے خاندان، گھربار کی معلومات اب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہیں اور نہ ہی تاریخ اور سوانح کی کتابوں میں اس بابت کچھ تحریر ہے۔میراجی کی تاریخ پیدائش بھی تاریخ و سوانح کی کتب میں دستیاب نہیں ہیں لیکن ان کے خلیفہ میرا یعقوب نے اپنی کتاب شامل الاتقیا میں 70 سال ان کی عمر بتائی ہے اور 1074 ہجری کو ان کی وفات بتائی ہے۔

دین اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے میراجی نے دکن کے سلطان کی ملازمت کو ترک کردیا اور دین اسلام کی تبلیغ کرنے لگے اس درمیان انہوں نے تصوف پہ بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔یہ تمام کتب انہوں نے دین اسلام کی ترویج و اشاعت اور مریدین کی رہنمائی کے مقاصد کو ملحوظ خاطر رکھ کر تحریر کیں۔ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے شرح تحدیدات کا ترجمہ فارسی سے دکنی زبان میں نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

میراں جی خدا نما کا شمار ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے اردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار قائم کیا، میراں جی کے تینوں رسالوں ''شرح شرح تمہیدات عین القضات، رسالہ وجودیہ، اور رسالہ مرغوب القلوب'' میں مسائل تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان کی زبان پر قدامت کی چھاپ گہری نہیں۔ان کی نثر عام فہم اور سلیس ہے۔گنجلک اور پیچیدہ عبارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔کہیں کہیں قافیے سے بھی کام لیا ہے۔خدا نما کی نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مثالوں کے ذریعہ سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں ان مثالوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام مثالیں انہوں نے روزمرہ زندگی سے اخذ کی ہیں کیوں کہ ان کے مخاطب ایسے عوام تھے جن کے لئے تصوف کے اسرار و رموز کی تفہیم آسان نہیں تھی۔ خدا نما نے ان کی عملی اور ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مطالب کی سادہ زبان میں مثالوں کی مدد سے اچھی صراحت کی ہے۔

حضرت امین الدین سے خلافت پانے کے بعد میراں جی نے اسلام کو پھیلانے کا کام شروع کر دیا۔اس کام کے لئے انہوں دکنی زبان میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ان کی کچھ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔رسالۂ وجودیہ

۲۔رسالۂ قربیہ

نثری تصانیف:

۱۔رسالۂ وجودیہ

۲۔رسالہ مرقوب القلب

شعری تصانیف:

۱۔بشارت الانوار

۲۔دو مثنویاں

۳۔دو غزلیں

میراں جی کا اسلوب:

اس دور کے دوسرے اہم نثر نگاروں کی طرح میراں جی حسن خدا نما کے اسلوب میں بھی مغلوں کے سیاسی اثرات، علمی و ادبی اثرات کی شکل میں ڈھلتے ہوئے ملتے ہیں۔ میراجی کی تحریروں سے ہم اس بات کا تجزیہ کر سکتے ہیں کہ پرانے الفاظ متروک ہو رہے ہیں۔ پرانی تراکیب پسپا ہو رہی ہیں۔اور ان کی جگہ نئے سانچے بن رہے ہیں۔ چنانچہ صدیوں پرانے دکنی اسلوب میں واضح طور پر ایک نئے لسانی عمل کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ جہاں زبان کا ایک نیا پیکر وجود میں آ رہا ہے جس پر فارسی اسلوب تیزی سے اثر انداز ہوتا ہے اور پرانی زبان کی نئی لسانی تشکیلات کا دور شروع ہونے لگتا ہے یوں دکنی ایک نئے رنگ و روپ میں ڈھلنے لگتی ہے۔اور یہ سب کچھ ان سیاسی اثرات کا نتیجہ تھا جو طویل عرصے سے دکن کی سرزمین پر مرتب ہو رہے تھے جن کے لسانی نتائج میراں جی حسن کے رسائل ہیں۔

اسلوب چونکہ صرف کسی شخصیت کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ اسلوب کسی عہد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ہیئت اور ساخت میں مختلف اجزائے ترکیبی، جیسے لفظ ، تراکیب، استعارے اور

محاورے مل کر اس اسلوب کی کلیت کو مرتب کرتے ہیں اور اسلوب کی اس کلیت میں جو چیز بہت اہم ہے وہ بدلتا ہوا لسانی شعور ہے۔ میراں جی کے دور میں تہذیبی و لسانی حوالوں کے سبب فارسی غالب آرہی تھی اور جو اس سے اپنے ماضی کے پرانے اسالیب سے واضح طور پر مختلف رنگ دے کر متن کے ایک نئے رنگ کا سراغ دے رہی تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی صرف نثر ہی میں نہیں تھی بلکہ شاعری کے اسلوب بھی یکساں بدل رہے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ سیاسی و تہذیبی تبدیلیوں سے زندگی بدل رہی تھی۔ زندگی کے مظاہر بدل رہے تھے اور ادب بھی ان مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اس لئے اس دور کی نثر میں فارسی کا غالب آنا ایک فطری بات ہے۔

خدانما کے اسالیب میں سادگی اور سلاست کا عمل بڑھ رہا ہے۔ ایک طرح زبان کے ڈھانچے میں توسیع پیدا ہونے لگتی ہے۔ زبان کے ذخیرہ میں پیدا ہونے والا پھیلاؤ اظہار بیان کے قرینوں کو سہل، بامعنی، آسان اور سلیس بنا دیتا ہے۔

خدانما نے ''شمائل الاتقیا'' کا ترجمہ کیا جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ابلاغ کے مسئلے پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ادق مسائل کو بھی اس نے آسانی سے سمجھانے کی کوشش کی ہے ترجمہ میں بلاوجہ کی بناوٹ یا مطالب کی ترسیل میں رکاوٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ ترجمہ کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

''جس پتھر پر سال میں ایک بار خدا کی نظر ہوتی ہے اس کا زیارت کرنا فرض ہے تو دل کا تواف (طواف) ہو زیارت کرنا اس سے بہتر ہے کہ دل پر ہر روز تین سو ساٹھ بار خدا کے لطف کی نظر ہے قول خواجہ بایزید: دل کے لوکاں کا زیارت کرنا بہتر کرنا ہے ستر بار کعبے کی زیارت کرنے تھے ظاہر کا کعبہ پھتراں کا ہے ہور باطن کا کعبہ اسراراں کا۔ وہاں خلق طواف کرتے ہیں۔ یہاں خالق کے کرم ہور مدد جو پھیرا پھیرتے ہیں وہاں مقام ہے ابراہیم خلیل کا یہاں مکان ہے۔ رب جلیل کا۔ وہاں ایک چشمہ ہے زمزم، یہاں کی پیالے ہیں محبت کے دم بدم۔۔۔''

میراں جی کے طرز نگارش میں، تخلیقی اور فکری امتزاج نظر آتا ہے۔

چکی نامہ:

میراں جی کی چکی نامہ 1070 سے پہلے شائع ہوئی۔ میراں جی نے چکی نامہ میں ذکر و اذکار کی باتیں لکھی ہیں اور اس کا نام چکی نامہ اس لیے رکھا کہ یہ ان مریدین کے لئے لکھی گئی تھی جو چکی چلایا کرتے تھے تاکہ وہ اس کتاب کے ذریعہ چکی چلانے کے وقت میں بھی اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہوں اور ذکر و اذکار کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ دعائیں اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے ایسی نیک باتیں درج ہیں جن کو جاننا اور یاد رکھنا ہر مرید کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح سے میراجی نے چکی نامہ میں اسلامی تعلیمات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دکنی زبان میں لکھ دیا جس کے نتیجے میں دو فائدے سامنے آئے ایک یہ کہ یہ کتاب مریدین کے لئے سلوک کی راہ کو طئے کرنے میں کافی مددگار و معاون ثابت ہوئی، دوسری یہ کہ اس کتاب کے ذریعہ سے دکنی ادب میں ایک اور اضافہ ہوا۔

میراں جی عبداللہ قطب شاہ کی کورٹ گولکنڈہ کی ریاست میں کام کرتے تھے۔ان کی شاعری کی کتاب دوسرے کتب خانوں میں موجود یا دستیاب نہیں ہے ۔لیکن پھر بھی میراں جی کی اردو شرح ''شرح تمہیدات عین قضات''اس وقت کی بہت ہی مشہور ومعروف کتاب تھی۔

میراں جی بحیثیت شاعر:

جیسے وہ ایک بہت بڑے صوفی اور بزرگ تھے ویسے ہی وہ بہت بڑے اسلامی شاعر اور اپنے وقت کے ایک مایہ ناز مصنف بھی تھے۔اسوقت کے دوسرے شعرا مثلا محمد قلی قطب شاہ ،عبد اللہ قطب شاہ ، وجہی ،غواصی ، ابن نشاطی کے مقابلے میں ان کی ادبی حیثیت کم ہے مگر میراں جی اپنی شاعری کا استعمال دکن میں اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے کرتے تھے جبکہ یہ کام میراں جی سے پہلے ہی دکن کے دوسرے صوفیا نے شروع کر دیا تھا۔

ان کی نظم ''بشارت انوار'' میں ان کا طرز بالکل جانا پہچانا لگتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میراں جی شاعر سے زیادہ نثر نگار تھے اسی لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنی کتاب ''اردو کی نشو نما میں صوفیا کا کام'' اور ''قدیم اردو'' اور نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں رقمطراز ہیں کہ میراں جی صرف ایک بہت اچھے نثر نگار تھے۔قدیم زمانہ میں تقریباً گیارہویں صدی میں ریاست گولکنڈہ میں نثر نگاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی جب کہ اُردو کے فروغ میں ان کا بھی بہت اہم حصہ تھا۔علاوہ ازیں اس وقت نہ جانے کتنے بڑے بڑے نثر نگار موجود تھے۔ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔میراجی خدانما ۲۔مولانا اسداللہ وجہی

۳۔میرایعقوب ۴۔عابدشاہ

گولکنڈہ کے مقابلہ میں بے جاپور میں نثر نگاری کا فن معراج کمال کو پہنچ گیا تھا۔قلعہ گولکنڈہ کی کتاب ''سب رس'' جس کے مصنف ملا وجہی تھے بہت ہی مشہور ہو چکی تھی' لیکن میراں جی کی کتاب ''شرح تمہیدات عین عین قضات'' جو کہ بہت ہی ضخیم ہے' جس کے ذریعہ سے ہمیں میراجی کی اردو زبان پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر چہ آج ہم اس بزرگ کو بھول چکے ہیں یا پھر ان کے تئیں فروگذاشت سے کام لیتے ہیں مگر مرقومہ بالا تمام وجوہات کی بنا پر قدیم زبان کی اردو نثر نگاری کے حوالے سے ہم میراں جی کا نام لیتے رہیں گے اور اس صوفی بزرگ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

میراں جی خدانما کے انتقال کی بابت ادیبوں نے اختلاف کیا ہے۔کسی نے 1070 بتایا ہے تو کسی نے 1078 مگر ان کے خلیفہ میرایعقوب نے اپنی کتاب ''شامل اتقیا'' میں 1074 ان کی وفات کی تاریخ درج کی ہے۔اس طرح سے اردو کی بنیاد ڈالنے والے بزرگوں کی صف میں کھڑا ہونے والا یہ ستون اردو کو ایک نئی سمت دے کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جے۔محمد شفیع
شعبہ اُردو ڈاکٹر عبدالحق اُردو یونی ورسٹی
کرنول، آندھراپردیش

ناول ''امراؤ جان ادا'' تہذیب کے تناظر میں

ناول '' امراؤ جان ادا '' مرزا ہادی رسوا کی شاہ کار تخلیق ہے۔ یہ ناول انہوں نے 1899ء میں تخلیق کی۔ اس ناول کا موضوع ایک طوائف کی زندگی ہے جس وقت رسوا نے یہ ناول لکھا ان کے سامنے لکھنو کا وہ دور تھا جس میں طوائف بھی اس وقت کے معاشرے کا ایک اہم حصہ ہوا کرتی تھی جس کی تصویر کشی کر کے رُسوا نے اس دور کی زندگی کا ایک تصور ہمیں دے دیا ہے۔ رُسوا نے اس دور کے حالات کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ بطور خاص لکھنؤ کی تہذیب کو اپنے ناول میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

رُسوا نے لکھنو کے معاشرے کو جس انداز میں تخلیق کیا ہے اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور ان کے منفرد انداز کا پتہ چلتا ہے۔ امراؤ جان ادا کی کامیابی رُسوا کے کرداروں کو پیش کرنے کا انداز ہے۔ ایک طوائف کو موضوع بنا کر ناول لکھنے کے باوجود اس کردار کی اہمیت کم ہونے کے بجائے بڑھ چکی ہے، کیوں کہ رُسوا نے جس قابلیت کے ساتھ اس کہانی کا تانا بانا بنا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے، جس وقت ''امراؤ جان ادا'' تخلیق کی گئی اس وقت لکھنؤ کی تہذیب بحران کی آخری منزل کو پہنچ چکی تھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے لکھنؤ کی اس تہذیب کا نقشہ بیان کیا ہے۔

رُسوا نے ناول کا آغاز مشاعرے سے کیا ہے جو کہ اہندوستان کی ادبی تہذیب ہے۔ دیکھیے :

'' میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔ لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان ادا اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہو، کبھی انہوں نے کچھ گایا۔ احباب محظوظ ہوتے۔'' (امراؤ جان ادا، ص: ۱۷)

لکھنو میں اس وقت جو تہذیب تھی اس کا ایک حصہ طوائف، دوسرا مشاعرہ اور تیسرا موسیقی مندرجہ بالا اقتباس میں تینوں کا ذکر رُسوا نے کیا ہے۔

امراؤ کا ایک شعر دیکھیے جو رُسوا اپنی زبانی ادا کروا رہے ہیں:

امراؤ: ''میں عرض کیے دیتی ہوں :
کعبے میں جاکے بھول گیا راہ دَیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی''

یہ ایک طوائف کا تخلیق کردہ شعر ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں جو طوائف ہوتیں تھیں وہ مذہب کا بھی خیال رکھتی ہے اور اپنے ایمان کی فکر بھی اسے ہے۔

دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے کی جو تہذیب ہے یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت ہی خاص ہے۔اس کا ذکر رُسوا نے کئی جگہوں پر کیا ہے۔مثال:

''جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی، میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھالائی' دسترخوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔خدا کا شکر کیا۔'' (امراؤ جان ادا۔ص:۳۹)

رُسوا نے یہاں امیرن کے گھر کی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے جو ایک جمعدار کی بیٹی ہے جو فیض آباد سے تعلق رکھتی تھیں۔یہ اس کے گھر کے دسترخوان کا ذکر تھا۔

جب رُسوا اس کے لباس اور زیور کا ذکر کرتے ہیں تو دیکھیے :

''پاؤں میں لال گلبدن کا پائجامہ، چھوٹے چھوٹے پائچوں کا ٹول کا نیفہ، نینوں کی کُرتی' اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔'' (امراؤ جان ادا،ص۔۴۱)

جمعدار سے اونچا گھرانہ زمیندار کا ہوتا ہے۔ جہاں امیرن کی شادی ۹ (نو) برس کی عمر میں طے کی جا چکی تھی۔رُسواء اس گھر کی تہذیب کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں جو نواب گنج میں واقع ہے:

''وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔مکان تو کچّا تھا مگر بہت وسیع۔دروازے پر چھپر پڑے تھے۔گائے بیل بھینسیں بندھتی تھیں۔گھی دودھ کی افراط تھی۔اناج کی کثرت، بُھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بُھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔کوئی کہاں تک کھائے۔'' (امراؤ جان ادا، ص۔۴۱)

یہاں رُسوا نے زمیندار کے گھر کا منظر دکھایا ہے۔زمیندار کا بیٹا جس سے امیرن کی شادی ہونے والی تھی۔اس کے لباس کا ذکر دیکھیے :

''سبز چھینٹ کا دگلہ، گلبدن کا پائجامہ، مصالحہ کی ٹوپی، مخملی جوتا۔'' (امراؤ جان ادا۔ص:۴۲)

یہ اس دور کے خوش حال گھرانوں کا رہن سہن تھا جس میں رُسوا نے دسترخوان سے لے کر ان کے کھانوں اور ان کے لباس اور اس دور کے اچھے گھروں کی بناوٹ کا ذکر سادہ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔

لکھنؤ کی طوائفوں کے رہن سہن کا' ان کے کھانوں کا ذکر رُسوا اس طرح کرتے ہیں:

''اچھے سے اچھا کھانے کو۔کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی آگاہ نہ تھی۔کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں نہ دیکھے تھے۔۔۔دن رات ناچ گانا، جلسے' تماشے، میلے باغوں کی سیر۔وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔'' (امراؤ جان ادا۔ص:۵۷)

طوائف ہو کہ لکھنو کے نواب صاحبان سب کو حقّہ، پان، میوہ، میٹھائیوں کا بہت شوق تھا، اور جو بھی مہمان آتے انھیں ان سب چیزوں سے تواضع کی جاتی۔

''آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں بنّن کے یہاں جاو خاصر مدارات میوہ، میٹھائیاں، حقّہ، پان۔ (امراؤ جان ادا۔ص۔۶۹)

''لکھنو کا عیش چین اور اپنا کمرہ یاد آتا تھا، ادھر ایک آواز دی ادھر آدمی مستعد حقّہ، پان، کھانا، پانی جو کچھ ہو اِدھر منھ کیا ادھر سامنے موجود'' (امراؤ جان ادا، ص۔۱۶۷)

''اتنے میں خدمت گار حقّہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑے بی مزے لے لے کر حقّہ پینے لگیں، میں ایک پان پر کتھا لگا کر ڈلیوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا' ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے' پان دان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔''

(امراؤ جان ادا،ص۔۱۸۰)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کا ایک اہم حصہ پان اور حقّہ تھا۔ جو عام لوگ بھی استعمال کرتے تھے اور خاص لوگ بھی ان چیزوں کا رُسوا نے اپنے ناول امراؤ جان ادا میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہوں پر ذکر کیا ہے۔

لکھنؤ نوابوں کا شہر تو کہلاتا تھا لیکن طوائفوں کے شہر سے بھی اس کو شہرت حاصل ہے۔ اسی لیے جب بھی وہاں کی تہذیب کا ذکر کیا جائے نوابوں کے ساتھ ساتھ طوائفوں کی تہذیب بھی بتانا ضروری ہو جاتا ہے۔ رُسوا نے تو نوابوں سے زیادہ طوائفوں کی تہذیب کا بیان ناول میں کیا ہے۔ رُسوا نے طوائفوں کی ایک رسم مسّی کا ذکر اس طرح کیا ہے دیکھیے:

''بسم اللہ کی مسّی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلا رام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی، دور دور سے ڈیرہ وار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویّے دِلی تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔

(امراؤ جان ادا، ص۔۷۲)

لکھنو کے نوابوں کی شادیوں میں بھی مجرا عام بات تھی بلکہ شان سمجھا جاتا تھا۔ رُسوا نے اپنے ناول میں میر نواب شجاعت علی خان کے لڑکے کی شادی کا منظر اس طرح بیان کیا ہے دیکھیے:

''مگر پہلا مجرا میر نواب شجاعت علی خان کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند تکیے، سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقّوں کی خوشبو، گلوریوں کی مہک سے دماغ معطر تھے۔'' (امراؤ جان ادا، ص۔۸۷)

یہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لکھنو میں نوابوں کی شادی کس طرح عالیشان طریقے سے انجام پاتی تھی۔

محرّم لکھنو میں بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا پورے دس دن لوگ پابندی سے اس کو مناتے۔ کس طرح مرثیے پڑھتے اور پڑھوائے جاتے رُسوا لکھتے ہیں۔ دیکھیے:

'' خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں پٹکے شیشہ آلات جو شے تھی نادر تھی۔ عشرۂ محرم میں دس تک روز مجلس ہوئی تھی۔ عاشورے کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خوان میرے سامنے منھ نہ کھول سکتے تھے۔ اِسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نواحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو امام باڑہ میں ماتم کر کے مجھے درِ دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا، کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔''

(امراؤ جان ادا، ص۔۱۰۷)

رُسوا نے یہاں ایک نقشہ کھینچا ہے۔ اس دور کی لکھنؤ کی تہذیب کو جو آج موجود نہیں ہے۔ عید برات کچھ بھی ہو طوائفوں نے اپنا رول ادا کیا تھا۔

نوابوں کے گھروں میں کس طرح بچوں کی سالگرہ منائی جاتی تھی' یہ تو رُسوا بتا رہے ہیں لیکن ساتھ میں ہمیں یہ بھی یہاں معلوم ہوتا ہے کہ زنانہ محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ دیکھیے:

'' بڑی بی:- ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے زنانہ جلسہ ہوگا تمہارا مجرا کیا ہے؟''

(امراؤ جان ادا، ص۔۱۷۹)

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔''

(مراؤ جان ادا، ص۔۱۸۱)۔

''ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لیے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ۔

کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب بر آمد ہوئیں۔

(امراؤ جان ادا۔ص:۱۸۲)

رُسوا نے ایک رسم سالگرہ کا ذکر تو کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس دور میں نواب گھرانے کی عورتیں زنانہ محفلیں منعقد کرواتی تھیں اور پردہ کرنے کو بھی اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

رُسوا نے بیگمات کے زیورات اور لباس کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔ دیکھیے:

''لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔

مہین بسنتی دوپٹّہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کا شلوکا پھنسا پھنسا۔ سرخ گرنٹ کا پاجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھ میں سونے کے سمرنین، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں، چہرے کی خوبصورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔'' (امراؤ جان ادا، ص۔۱۸۳)

اس دور میں نوابوں کی بیگمات کے زیور اور لباس کی عکاسی رُسوا نے دلچسپ انداز میں کردی ہے۔

رُسوا نے لکھنو کی حویلیوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور اس میں جس طرح کے ساز وسامان ضروری سمجھے جاتے تھے اس کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ طوائفوں کے گھروں میں بھی نوابوں کی طرح کسی چیز کی کمی نہ ہوتی تھیں۔ نواب صاحب کی کوٹھی کا نقشہ دیکھیے:

''اب ہم کوٹھی کے پاس پہونچ گئے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طریقے سے سجی ہوئی تھی کی شاہی کوٹھیوں کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمادہ ملا اس کے بعد کئی کمروں سے ہوکے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا ہر کمرے کا فرش فرش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور طرز کا تھا۔'' (امراؤ جان ادا۔ ص:۱۸۷)

یہ تو تھا ایک حویلی کا نقشہ۔ اس کے علاوہ طوائفوں کے کوٹھے کس طرح ہوتے تھے اور عام آدمیوں کے گھر کس طرح کے ہوتے تھے سب کچھ ناول امراؤ جان ادا میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔

جب نوابوں کی حویلی کے کھانوں کا ذکر کرتے ہیں تو دیکھیے:

''دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بریانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربّے، مٹھائیاں، دہی، بالائی، غرض کہ ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔

(امراؤ جان ادا، ص۔۱۸۸)

دسترخوان پر کھانا کھانے کے بعد کے اداب دیکھیے۔

''بیسن دانی اور تسلہ آیا۔ ہاتھ منھ دھو کے سب نے پان کھائے۔'' (امراؤ جان ادا۔ص:۱۸۸)

یہ تھا ان لذیز کھانوں کا ذکر اور کھانے کے بعد کے اداب کا ذکر جو لکھنؤ میں مشہور تھے اور اب بھی ہیں۔

ناول ''امراؤ جان ادا'' میں رُسوا نے لکھنؤ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس دور کے لکھنؤ کا ایک خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے رُسوا نے ایک تہذیب کو زندہ رکھا ہے جب تک یہ ناول رہے گا' اس تہذیب کو کوئی بھلا نہیں سکتا۔ آج ہمیں اس دور کی تہذیب کا پتہ اس ناول کو پڑھنے کے بعد ہو رہا ہے اور ہم اس وقت کے معاشرے کو ان میں جو اعلیٰ اور ادنیٰ تہذیب تھی' اسے جان رہے ہیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی اس ناول کے ذریعے لکھنؤ کی تہذیب کو جان سکے گی۔

☆☆☆

سلیم انور
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی،
الہ آباد۔ 211002

احتجاجی رنگ وآہنگ کا شاعر: احمد فراز

احمد فرازؔ کا شمار نئی غزل کے چند معتبر اور معمر شعرا میں ہوتا ہے جن کا فن امتیازی جواہرات سے ملمع اور جن کی شخصیت انفرادی کوائف سے مسجع ہوکر محضرِ غزل پر جلوہ گر ہوئی۔ جس طرح شعروادب کی دنیا میں علامہ اقبال کا نام اسم بامسمع ثابت ہوا اور بلند اقبالی و ناموری کے تمام مدارج طے کئے، اسی طرح احمد فرازؔ کو بھی اپنے تخلص کی مناسبت سے قدر و منزلت کی بے پناہ عظمتیں نصیب ہوئیں۔ یوں تو ان کے والد نے ان کا نام احمد شاہ تجویز کیا تھا لیکن انھوں نے شاعری کی دنیا میں فرازؔ تخلص اختیار کیا اور ان کی شاعری کو وہ ابدی حیات ملی جو صرف فرازؔ ہی کی غماز رہی۔ نشیب سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں۔ فرازؔ کو دنیائے شاعری میں اس قدر پسند کیا گیا کہ لوگ اپنے نومولود بچوں کا نام انھیں کی مناسبت سے فراز رکھنے لگے۔ خود فراز کہتے ہیں:

اور فرازؔ چاہیے کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

ooo

فرازؔ ایک مختلف الجہات اور منفرد نظریۂ فکر کے متحمل شاعر ہیں۔ ان کا لب ولہجہ بے حد دل نشیں، وجدان و جمالیاتی شعور سے مزین اور اندازِ بیان انتہائی پرکشش اور بیباک ہے۔ فراز نے اپنی فکری محاکات کو کسی وضعِ خاص کا پابند نہیں بنایا بلکہ دیگر جدید شعرا کے بالمقابل کلاسیکی اسلوب کے تتبع کو ترجیح دی۔ اسی لیے ان کی بیشتر غزلیں اساتذہ کی زمین پر ہیں۔ اور شاید اسی لیے ان کی زبان و بیان میں فارسی غزل اور اُردو کی کلاسیکی غزل کے رنگ آئینے کی طرح عیاں ہیں۔ انھوں نے اساتذہ کے کلام سے استفادہ کیا اور ان کی پیروی کرتے ہوئے اپنی الگ راہ نکالی جو ان کے ساتھ مخصوص ہے۔

فرازؔ ایک طویل العمر شاعر تھے جس کے باعث شاعری کی دنیا میں لمبی مدت تک مسافرت کا موقع ملا۔ تجربات ومشاہدات کے ایک بے کراں سمندر کو اپنے ذہن ودل میں مقید کیا تھا جس سے ان کی فکری وفنی کائنات کافی وسیع اور آراستہ و پیراستہ ہوگئی۔ ان کی غزلوں کو ایک ایسی قوس قزح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس میں بے شمار رنگ

ہیں۔اول تو یہ رنگ ہماری آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہیں دوسرے یہ کہ یہ رنگ امکانات کے نئے نئے دریچے بھی کھولتی ہیں۔ان کی غزلیہ شاعری کے متعدد رنگ ہیں۔ کہیں حسن وعشق کی کیفیتیں ہیں کہیں ہجر و وصال کا سنگم، کہیں اخلاق وتصوف کی نرم پھوار ہے تو کہیں سماجی وسیاسی سرگرمیوں کی گھن گرج، کہیں عاجزی و انکساری کی گل افشانی ہے تو کہیں احتجاج و مزاحمت کی شعلہ نوائی۔لیکن ذیل کے سطور میں ان کے جس پہلو پر روشنی ڈالنا مقصود ہے وہ ان کا احتجاج وبغاوت کا پہلو ہے۔

فرآز باغی طبیعت کے مالک تھے۔ان کا باغی تیور بچپن سے ہی ظاہر ہوگیا تھا۔فراز کے بچپن کے دنوں میں ایک مرتبہ ان کے والدین بازار سے کچھ کپڑے لائے جن میں فرآز کے بڑے بھائی کے لیے سوٹ اور ان کے لیے کوٹ کے کپڑے تھے لیکن فراز کو وہ کپڑا جیل کے کمبل کی طرح بے رونق معلوم ہوا اور پسند نہ آیا۔اس سے ان کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی اور بغاوت کی چنگاری رگ وریشہ میں سرایت کرگئی، پھر یہ شعر کہا:

جب کہ سب کے واسطے لانے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

جب اس شعر کی بھنک ان کے والد صاحب کے کانوں تک پہنچی تو بے حد متاثر ہوئے اور اگلے روز ان کی پسند کے موافق کپڑے دلا دئے۔اس واقعہ سے فرآز کے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ احتجاج کس قدر اثر آمیز اور نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے۔چنانچہ یہ مزاج ان کی فکری دنیا میں بھی بتدریج نشو ونما پاتا رہا اور ان کا احتجاج پروان چڑھتا رہا۔جس سے شعری منظرنامے پر وہ ایک باغی اور ضدی شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ان کی اس احتجاجی طبیعت کے سبب بعض ناقدین نے انھیں اینگری ینگ مین کہہ کر پکارا۔اس تعلق سے ناصر پرویز لکھتے ہیں:

''فرآز اردو شاعری کا ایک باغی، ضدی اور موڈی شاعر ہے۔اس کے ساتھ سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ ظلم اور جبر کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔وہ اکثر اینگری ینگ مین کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو ظلم کے خلاف ہے اور مظلوموں کا حامی ہے۔''[1]

فراز کے اس مزاج اور طبیعت کے پیچھے ان کے عہد و ماحول کا انتہائی اہم رول رہا ہے۔وہ پاکستان میں مقیم تھے جب سارے ملک میں مارشل لا نافذ ہوگیا تو ہر طرف قتل و غارت گری اور ناانصافی کا بازار گرم ہوگیا۔ معصوم عوام کی آہ و بکا ان کے کانوں تک پہنچنے لگی تو اپنی طبیعت اور مزاج کے بموجب خاموش رہنا گوارا نہ کیا اور بول پڑے:

اس عہدِ ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگے

ooo

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فرآز
میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی

ooo

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

اس طرح انھوں نے اپنی نوکِ زباں کے ساتھ ساتھ نوکِ قلم کو بھی حرکت دی اور فوجی حکومت کے خلاف احتجاج کا نعرہ بلند کیا۔ وہ ایک سچے انسانیت نواز اور انصاف پسند فنکار تھے۔ حق گوئی اور بیباکی کو بروئے کار لاتے ہوئے مظلوم اور دبے کچلے طبقے کی حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے آمرانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی جس کی پاداش میں انھیں جلاوطن بھی ہونا پڑا۔ فاروق ارگلی لکھتے ہیں:

''احمد فرازؔ اپنے عہد کے ایک سچے فنکار تھے، حق گوئی اور بے باکی ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ انہوں نے حکومت وقت کی بدعنوانیوں اور عوام کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف ہمیشہ کھل کر آوازۂ حق بلند کیا۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت پر سخت تنقید کرنے پر انہیں گرفتار بھی کیا گیا، وہ چھ سال تک کناڈا اور یورپ میں جلاوطنی کا عذاب سہتے رہے۔''[۲]

لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی اور بے باکی میں کمی نہیں آئی بلکہ ان کا علمِ بغاوت اور نعرۂ احتجاج تواتر کے ساتھ بلندی سے ہمکنار ہوتا گیا۔ اس آمرانہ نظام کے سبب عوام کو جن مسائل اور حالات و کیفیات سے دوچار ہونا پڑا، فرازؔ نے ان سب کی سچی تصویر اپنی غزلوں پیش کر دی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

رہا ہوئے پہ عجب حال ہے اسیروں کا
کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں
جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخلِ زنداں جاناں

ooo

گھر تو کیا گھر کی شباہت بھی نہیں ہے باقی
ایسے ویران ہوئے ہیں در و دیوار کہ بس

ooo

مندرجہ بالا اشعار میں اس وقت رونما ہونے والے حالات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اور واشگافانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی تصویر متشکل ہو جاتی ہے۔

فوجی حکومت کے دور میں جس طرح ان کے اہل کاروں نے سماج میں بدعنوانیاں پیدا کیں، اس سے سماج میں جس طرح کا ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول بنا، اس سے فراز کس طرح نبرد آزما ہوئے اور ان مصائب سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کیسے کیسے مزاحمتی پہلو اختیار کیا، اس موقف کا اظہار انھوں نے بڑی بیباکانہ اور احتجاجی شکل میں کیا۔ اس ضمن میں چند اشعار جن میں مخالفت، مزاحمت و احتجاج اور للکار کا پہلو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

دیکھ یہ حوصلہ مرے بزدل دشمن
تجھ کو لشکر میں پکارا تنِ تنہا جا کر

ooo

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کر دیا
اے شہر یار تو بھی تو اپنا حساب دے

ooo

شکایت اس کی نہیں ہے کہ اس نے ظلم کیا
گلا تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

ooo

پاکستان میں جب فوجی حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی اور اس کے جابرانہ رویے رونما ہوئے تو بہت سے شعراء نے ان کے خلاف اپنی آواز بلند کی لیکن وہ فرازؔ کی مانند بیباکی اور درا کی سے صف آرا نہ ہو سکے۔ دیگر شعراء نے اشاروں اور کنایوں کا سہارا لیا اور دبے چھپے لہجے میں دل کا غبار نکالا۔ لیکن فراز نے بڑی وضاحت کے ساتھ مخالفت کی۔ ان کے اس عمل پر حکومت نے ناگواری بھی ظاہر کی۔ انھیں بالواسطہ اور بلا واسطہ دھمکی آمیز خطوط بھی ارسال کیے گئے۔ اکثر احباب نے جو فوجی محکمے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے' فراز سے ملنا جلنا ترک کر دیا' کیونکہ انہیں بھی ڈر تھا کہ فراز کی قربت ان کے لیے عتاب کا سبب بن سکتی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی ان سے تنفر کا اظہار کیا۔ فراز نے ان سب باتوں کو محسوس کیا جس کا عکس ان کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے:

کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فرازؔ
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی

ooo

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کماں کھینچتا ہے

ooo

ہر دوست یہاں ابرِ گریزاں کی طرح ہے
یہ شہر کبھی شہر ہمارا بھی کبھی تھا

ooo

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

انہیں جہات و کیفیات کے ساتھ فراز کی غزلیہ شاعری کا سفر ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ سماجی و سیاسی مسائل ان کے ورطۂ تحریر میں آتے رہتے ہیں۔ روزِ ازل سے ہی سماج دو طبقوں میں منقسم رہا ہے ایک جابر دوسرا مجبور۔ پہلے طبقے کا مقصد اور نصب العین یہ رہتا ہے کہ اس کا اقتدار اور اثر و رسوخ کا پرچم آسمان پر ہو، اس کے لیے ظالمانہ عمل کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ دوسری قوم جو مظلومیت کا شکار رہتی ہے، دراصل اس کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ جو ظالم قوم کے جابرانہ رویے کو سر جھکا کر تسلیم کر لیتا ہے۔ امیر اور سرمایہ دار اس قوم کا استحصال کرتے ہیں مگر وہ خاموش رہ کر سب برداشت کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں' ان جابروں کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند نہیں کرتے۔ ظالموں اور جاگیرداروں کو ان سے کوئی نقصان نہیں ہے۔ اسی مظلوم قوم میں ایک دوسرا طبقہ بھی ہے جو سرمایہ داروں کی ظالمانہ یورشوں کو گوارا کرنا اپنی حمیت کی تذلیل گردانتا

ہے۔ ان کے خلاف وہ مزاحمتی پہلو اور احتجاجی موقف اختیار کرتا ہے۔ احمد فرازؔ کا تعلق اسی دوسرے طبقے سے ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دنیا کا ایک گروہ دوسری قوم پر مطلق العنانی کے ساتھ ظلم و جور کا بازار گرم کیے ہوئے ہے تو ان کا ضمیر مجروح ہو گیا۔ انہوں نے نہ صرف مجاہدانہ طریقے پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا بلکہ اس بلا سے عوام کو نجات دلانے کے لیے اور سماجی نابرابری کو دور کرنے کے لیے حق وصداقت کے ساتھ نغمۂ احتجاج چھیڑا بلکہ اپنی غزلوں میں احتجاج اور مزاحمت کا پہلو بھی اختیار کیا، جابر قوم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت میں بھی اشعار قلم کیے لیکن اس عمل میں انھوں نے غزل کے کلاسیکی آداب کی پاسداری کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ فن کے تقاضے اور زمانے کے مسائل کو اس خوش اسلوبی سے آپس میں شیر وشکر کیا ہے جس سے ان کی غزلوں کی شعریت برقرار رہتی ہے۔ اس تعلق سے شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

''فراز کی شاعری میں کلاسیکی آداب کی پاسداری کے علاوہ افکار، احتجاج اور مزاحمت کا میلان بھی اپنے تمام معاصرین کے مقابلے میں زیادہ روشن اور تابناک دکھائی دیتا ہے..... فرازؔ کے یہاں کلاسیکی دروبست اور شعر کے فنی محاسن نے ان کے حرف احتجاج کو کبھی عریاں نہیں ہونے دیا۔ وہ سخت سے سخت بات بھی سنبھل کر کہنے کا گر جانتے ہیں۔''[۳]

فراز نے جاگیرداروں کے ظلم کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی اور ان کے مدمقابل نبرد آزمائی کا ثبوت پیش کیا ہے:

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

ooo

زخموں سے چور جسم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں انھیں کو علم کریں

ooo

میں چپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف

ooo

احمد فراز کے تمام تر سرمایۂ غزل کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنے پر ان کی احتجاجی نوعیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنی فکر کی ڈور فن سے جوڑے رکھا، اسی لیے ان کی شاعری میں ہنگامہ آرائی یا نعرے بازی کا احساس نہیں ہوتا۔

☆☆☆

۱۔ ''کلیات احمد'' فرید بک ڈپو، ۲۰۱۰ء فراز، ص:۴
۲۔ اردو شاعری کا اینگری ینگ مین: احمد فراز، ناصر پرویز، ایوان اردو، دہلی مارچ ۲۰۱۴ء۔ ص:۳۰
۳۔ ''احمد فراز کی شاعری'' شمیم حنفی، مشمولہ: کلیاتِ احمد فراز، فرید بک ڈپو، ۲۰۱۰ء۔ ص:۴۷۔۱۰۷۳

☆☆☆

حارث حمزہ لون
ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو
دیوی اہلیہ وشودھیالیہ اندور (ایم۔پی)

اکیسویں صدی اور ندائے اُردو

وہ زباں جس کا نام ہے اُردو
اُٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح
(مخدوم محی الدین)

اکیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ جدید ایجادات اور دریافتوں کے سبب نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک اس دنیا کو دوام حاصل ہے اس وقت تک انقلاب رونما ہوتے رہیں گے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی کے تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جینے کے طریقے بدلیں گے تو اس تبدیلی سے زبان بھی لازمی طور پر متاثر ہوگی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عالمگیریت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ سے ہمیں خواہ کتنا ہی فائدہ ہوا ہو لیکن لسانی معاملے میں بڑا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ معروف ماہر لسانیات اینڈریو ڈلی نے اپنی کتاب "Language in Danger" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں الگ الگ اسباب سے کچھ زبانوں کی بالادستی قائم ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کچھ زبانیں سمٹ کر تاریکی میں جا رہی ہیں اور یہ سب گلوبلائزیشن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ گلوبلائزیشن کا مطلب ہی ہے کہ پوری دنیا کا ایک گاؤں میں تبدیل ہونا اور یہ تبدیلی صرف ساز و سامان کی تجارت تک محدود نہیں بلکہ اس کا اثر انسانی زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہا ہے۔ جہاں تک زبانوں پر اس کے اثرات کا تعلق ہے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو پر بھی اس کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔ آج انگریزی کو گلوبلائزیشن کی زبان قرار دینے کے پس پردہ پوری دنیا پر انگریزی کو تھوپنے کی کوشش ہی تو کی جا رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا پیمانہ بھی ہے۔ اسی کے ذریعۂ ہی مختلف حالات و موضوعات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ ہوا کہ جو زبانیں زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں وہ معدوم ہو جائیں گی۔ بحالاتِ موجودہ اردو آبادی بھی انگریزی کو ہی ترقی اور عزت افزائی کی کنجی تصور کرنے لگی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جن لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ انگریزی کے بغیر ترقی ناممکن ہے، ان کو چین، جاپان اور جرمنی سے سبق سیکھنا چاہیے کہ ان ممالک نے اپنی اپنی زبان کی بدولت ہی تمام تر ترقیاتی منازل طے کیے ہیں۔ آج تعلیم برائے تعلیم ایک تخیّل بن گیا ہے اور تعلیم برائے تشخص اور تعلیم برائے معاش کا تصور عام ہو گیا۔

زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں سب سے مؤثر طریقہ زبان کی تعلیم و تدریس اور روز مرہ گفتگو میں اس کا

استعمال ہے۔ زبان صرف وسیلۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ تہذیب کی شناخت کا ذریعہ بھی ہے اور اسی کے ذریعے سماجی روابط کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے مسائل اور معاملات سے باخبر ہوتے ہیں اور اسی باخبری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے روابط استوار ہوتے ہیں۔

زبان الفاظ کے سہارے ہی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ جس طرح انسانی جسم کا کوئی تصور اعضا کے بغیر ناممکن ہے اسی طرح الفاظ کے بغیر زبان کا تصور بھی ناممکن ہے اور جس طرح تمام اعضا انسانی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں، اسی طرح اگر کسی زبان کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے تو وہ زبان اس انسان کی طرح ہے جس کا سر نہ ہو۔ ہر زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ اُردو دنیا کی بڑی زبانوں میں ہے اسے ایک معاشرے، ایک سماج اور ایک تہذیب نے اپنا خون جگر دے کر پروان چڑھایا ہے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستان کی چھ سات سو برس کی تاریخ بھی ہے جو ہندوستانیوں کے مشترکہ دکھ سکھ کی تاریخ ہے۔ ہندوستان قومیت کو اردو کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ اس نے تاریخ کو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ رکھا جس طرح فانوس میں چراغ روشن رہتا ہے اور جس طرح صبح کے ستارے کی روشنی میں کارواں، بانگ جرس کے ساتھ مقامات طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اسی طرح اردو نے بھی ہمیشہ مستقبل کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اردو ادب پر صوفیوں کا اثر ہے، صوفیا مسلمانوں میں روا دار تھے، متعصب نہیں تھے، انھوں نے مذہب اور ذات وغیرہ کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں میں آفاقی پیغام محبت کو عام کیا۔

اردو کے بعض قلمکاروں نے ہولی، دیوالی، راکھی اور دیگر ہندو تہواروں اور رسموں پر بڑی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اردو ادب کے صفِ اول میں اپنا نام درج کرا چکی ہے۔ مثال کے طور پر فراقؔ، چکبستؔ، رتن ناتھ سرشار، بیدی، کرشن چندر، پریم چند وغیرہ۔ ولیؔ اور نظیرؔ کی شاعری میں گنگا، جمنا، کرشنا، رام، سرسوتی، سیتا، لکشمی وغیرہ الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو نے درج فہرست قومی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے جیسا کہ یہ ملک کی تیرہ ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔ اس طرح سے اردو ایک ایسی زبان ہے جو دو زبانوں فارسی اور ہندوستانی کے امتزاج سے بنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں اسے ریختہ یعنی 'ملی جلی' کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کے مسائل پر عرصۂ دراز سے گفتگو ہو رہی ہے۔ رسائل و اخبارات میں ایسے مضامین اور خطوط چھپتے رہتے ہیں جن میں اردو کے تئیں ہمدردی اور فکر مندی ظاہر کی جاتی ہے۔ کانفرنسوں، سیمیناروں اور ورکشاپوں کے شہر دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں کی ایسی خبریں اور رپوٹیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے اردو والوں کی تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ الیکشن کے زمانے میں سیاسی دکانوں کے اشتہارات بھی دیواروں پر اور اخباروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔ بہتوں کی سیاسی تجارت یا تجارتی سیاست چمک اٹھتی ہے۔ ان کا اثر وہ لوگ بھی قبول نہیں کرتے جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ لوگ بھی نہیں جنھوں نے اردو کے ذریعہ عزت، شہرت اور دولت حاصل کی ہے اور وہ بھی نہیں جنھیں اردو نے ایک پہچان

اور ایک تہذیب سے نوازا ہے اور وہ بھی نہیں جنھیں اردو نے اسلاف کے قابل فخر کارناموں سے روشناس کرایا ہے اور مذہبی تعلیمات سے سرفراز کیا ہے، مستثنیات کی بات اور ہے۔ راقم کے نزدیک اردو کا مخلص اور یہی خواہ صرف وہی شخص ہے جو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی فکر کرتا ہے۔ یہ کام کسی اسکول کے وسیلے سے کیا جارہا ہے یا نجی طور پر اس سے کوئی بحث نہیں، عملی اقدام شرط ہے۔

کسی بھی ملک میں اس ملک کی اردو جیسی زندہ زبان کو جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بے شمار ہو اور جس کا ادب سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت ہو اور جس کی شیرینی اور لطافت کے سبھی معترف ہوں، زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے پڑھنے والوں کی بہرصورت حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور اس زبان کے فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ افسوس کہ اردو کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا، آزادی کے بعد ہی سے اس زبان کی حق تلفی ہوتی رہی اور آج بھی تھوڑی بہت اشک شوئی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو کی حق تلفی کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے جو علاقے اردو کے تھے، تقسیم کے بعد ان علاقوں کی زمین اردو پر تنگ کردی گئی۔ ملک کی تقسیم اور اردو کا پاکستان کی قومی زبان قرار پانا اس کا موجب بنا۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اردو کے سلسلے میں بھی یہ غلط رائے قائم کرلی گئی کہ یہ زبان تقسیم وطن کی ذمے دار ہے۔ یہ پروپیگنڈہ کچھ ایسے شاطرانہ انداز سے کیا گیا کہ اردو اور مسلمان برسوں اپنی صفائی پیش کرتے رہے اور اپنی بے گناہی کا ثبوت دیتے رہے۔ حملہ کچھ ایسا نفسیاتی اور منظّم تھا کہ اردو والے تو حواس باختہ ہوگئے تھے پھر آہستہ آہستہ جب یہ دھند چھٹی اور غبار بیٹھا تو خاصی دیر ہوگئی تھی اور اردو ناقابل تلافی نقصان برداشت کرچکی تھی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، نسلی اور لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو حقیقی بہنیں ہیں۔ دونوں کی قواعد ایک ہے، افعال ایک ہیں، لفظیات کے بڑے حصے میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جب تک ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اجنبی اصطلاحات شامل نہ کرلی جائیں، دونوں زبانوں کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غیر ہندی علاقوں میں اردو دوسری یا تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ان علاقوں پسندیدہ اور مقبول بھی ہے۔

دستورِ ہند کی رو سے ملک کی دیگر زبانوں کی طرح زبان اردو کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مگر صنعتی انقلاب اور عالم کاری کی وجہ سے دنیا کی بہت سی زبانیں آج کسمپرسی کا شکار ہیں' اردو بھی اس طوفان کی زد میں آگئی ہے۔ ہمارے ملک میں اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ عظیم زبان جس نے غالباً جدید ہندوستان میں بہترین ادب اور شاعری تخلیق کی۔ میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ، فراقؔ، پریم چند، کرشن چند، منٹو، بیدی وغیرہ اور جو ہندوستانی ثقافت کے خزانے کا درخشاں موتی ہے، آج نظرانداز کردی گئی ہے اور تقریباً اسے شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، میں اس سے بڑی حماقت تصور نہیں کرسکتا۔ اردو کے ساتھ اس ناانصافی کے دو غلط نقطۂ نظر تھے جو چند وقتی مفاد پرستوں کے ذریعے پھیلائے گئے تھے کی (۱) اردو ایک بدیسی زبان ہے (۲) اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

آج صرف دہلی کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کئی گنا بڑھ گیا ہے،لیکن اردو کے قارئین ناپید ہوتے جا رہے ہیں ۔اس کی ایک وجہ اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا ہے ۔اردو کی آوازیں بھی اب آہستہ آہستہ ختم ہورہی ہیں۔اردو کا املا بھی اب پہلے جیسا خالص نہ رہا۔اردو کی تحریر میں شاید اب وہ چاشنی بھی نہ رہی جو آج سے تیس چالیس سال قبل تک اس کی خصوصیت تھی ۔مزید یہ کہ اردو کا رسم الخط بھی اب خطرے میں پڑ چکا ہے۔یہ تو ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ جو لوگ اپنی زبانوں کی ترقی کے لیے محنت نہیں کرتے ،انھیں زندہ رکھنے کے لیے قربانیاں نہیں دیتے ،وہ زبانیں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان صرف ادب کے سہارے زندہ نہیں رہتی بلکہ سماجیات،عمرانیات اور سوشل معاملات ان تمام موضوعات کا احاطہ کریں جو ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے ہیں ۔آزادی سے پہلے ہمارے بزرگوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ لندن میں اردو کے مراکز اور تعلیم گاہیں قائم ہوں گی ۔امریکہ، نیویارک، کیلی فورنیا اور کئی دوسرے مقامات ایسے ہیں جہاں اردو کا چرچہ ہے ۔سعودی عرب سے اردو کا اخبار نکلتا ہے۔خلیجی ممالک میں اردو کا بول بالا ہے۔اُردو میں ایک عجیب وغریب انجذابی قوت ہے کہ یہ ہر زبان کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

اردو کے مسائل کا ایک پہلو یہ بھی ہے جو زیادہ تکلیف دہ ہے۔اس پہلو کا تعلق خود اردو والوں سے ہے۔اردو والوں کی کوتاہ اندیشی ، بے حسی اور غفلت شعاری کا ہاتھ ہے۔ اردو بولنے والے آتی جاتی حکومتوں سے شکوے شکایات کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی بقا کا سارا انحصار سرکاری سرپرستی پر ہے حالانکہ زبانیں صرف حکومتوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں ،سرکاری سرپرستی سے ان کی ترقی کی رفتار میں تیزی ضرور آجاتی ہے مگر اصلاً ان کے بولنے والے ہی ان کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہوتے ہیں ۔اردو بولنے والے اس بدیہی حقیقت سے آنکھیں چراتے رہے ہیں ۔ اردو بولنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جہاں تک شمالی ہند کے مسلمانوں کا تعلق ہے،اردو اُن کی مذہبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آج کے مسلمان جو عربی فارسی سے تقریباً نابلد ہیں اسی زبان کے وسیلے سے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ اردو کی بقا آج بے وجہ ان کی تہذیبی ، تاریخی اور مذہبی ذمے داری بن گئی ہے۔اسکولوں میں انتظام نہ ہونے کی صورت میں اگر وہ اپنے بچوں کو گھروں میں اردو پڑھائیں گے تو کوئی ان سے باز پرس کرنے نہیں آئے گا ۔ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمان سبھی مل کر اردو زبان پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے ۔آج اردو زبان سیکھنے والے غیر مسلم بچوں کی تعداد غیر ملکی زبانیں سیکھنے والے بچوں سے بھی کم ہے۔اس طور پر اہل وطن نے اردو کی بقا کی ساری ذمے داری عملاً مسلمانوں کے سر پر ڈال دی ہے۔

اردو کی افسوس ناک حالت کا ایک پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں ،خاص کر ہندی اور انگریزی کے ایسے اخبارات ورسائل خریدنے میں بھی اردو والوں کو کوئی عار نہیں جنھیں پڑھنے کے لیے نہ ان کے پاس وقت ہے اور نہ استعداد۔مگر وہ اردو کے رسالے اور کتابیں نہیں خریدتے ۔ یہ مرض ان حضرات میں

زیادہ تشویشناک ہے جو اردو کے ذریعے ہزاروں لاکھوں کما رہے ہیں اور چھوٹے بڑے اداروں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

ان باتوں میں صداقت ہے۔ پیکر تصویر کا کاغذی پیرہن اب دھیرے دھیرے رخصت ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ، ڈی وی ڈی اور سی ڈی وغیرہ کا اثر ہر زبان پر پڑ رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو جس مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستہ تھی وہ تہذیبی قدریں پس پشت جا پڑی ہیں۔ نیتجتاً ان تہذیبی قدروں کو فروغ دینے والی زبان پر بھی منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ اردو پر ظلم سب سے زیادہ خود اُردو والے کر رہے ہیں۔ ماہرین اردو کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ادبی نشستوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے اوپر پُر مغز اور مدلل تقاریر کرتے نہیں تھکتے، اور جنہوں نے اردو کی روٹی کھائی، اردو اوڑھی اور بچھائی، اور اردو کے ذریعے ملک گیر پیمانے پر اور بیرون ملک تک شہرت حاصل کی ' انھوں نے اپنے گھروں میں نئی نسل کو انگریزی بولنے کی ترغیب دیتے دکھائی دیتے ہیں۔

گذشتہ دہائیوں میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے اُردو کے لیے کچھ عملی اقدامات کیے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مادری زبان میں تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے طلبہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتے۔ آئین ہند کے آٹھویں شیڈیول میں اردو کو بھی قومی زبان کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستانی ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد سے مختلف صوبائی حکومتوں نے اردو کو دی جانے والی سہولتوں پر عمل آوری کے لیے ہدایات جاری کیں جن کی روشنی میں پرائمری سطح تک کی تعلیم کی سہولت ان تمام بچوں کو دیے جانے کی ہدایت دی گئی جن کے والدین یا سرپرستوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو میں اساتذہ کی تربیت اور نصابی کتابوں کی فراہمی، نیز عدالتوں اور دفاتر میں درخواستوں کی اردو زبان میں قبولیت، اردو کے تمام علاقوں میں اہم قوانین، قواعد وضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کرنے کی ہدایت بھی جاری کی گئیں۔ اردو زبان کو روزگار سے مربوط کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔ کیونکہ آزادی کے بعد سے یہ صورت حال اس قدر سنگین ہوگئی تھی کہ خود اردو والے روزگار کی عدم فراہمی کے خدشات کے سبب اردو میں درس و تدریس سے دوری اختیار کرنے لگے تھے۔

البتہ کہیں کہیں اردو والوں کی کامیاب نمائندگی کی بدولت ابتدائی سطح پر اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا۔ ریاست جموں وکشمیر جس کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی وہاں اردو میڈیم سے صرف ابتدائی جماعتوں سے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام رہا۔ ماضی میں اردو کے گہوارے کے طور پر شہرت رکھنے والی ریاست اتر پردیش میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واحد درس گاہ ہے جس میں ہائی اسکول تک اردو ذریعۂ تعلیم رائج ہے، جب کہ پوری ریاست میں چند مڈل اسکول ہیں جہاں اردو میڈیم کی جماعتوں کا انتظام ہے۔ کچھ ریاستیں ایسی ہیں جہاں سرکاری اور نجی سطح پر بارھویں جماعت تک اردو میں تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، دہلی اور مغربی بنگال کی ریاستیں شامل ہیں۔ بہار اور کرناٹک میں صرف دسویں جماعت تک اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ راجستھان اور ہریانہ میں چند پرائمری اسکول ہیں جہاں

اردو میڈیم جماعتوں کا انتظام ہے۔ گجرات میں صرف احمد آباد میں اردو میڈیم کے دو سیکنڈری اسکول قائم ہیں۔ ہندوستان میں آندھرا پردیش ملک کی واحد ریاست ہے جہاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے پہلے چند یونیورسٹیوں کے ملحقہ کالجوں میں اردو میڈیم میں گریجویشن کی تعلیم دی جارہی ہے۔ حیدرآباد میں خاصی تعداد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ کالج ہیں جہاں اردو میڈیم میں تعلیم کا انتظام ہے۔

مرکز میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ریاستوں میں اردو اکادمیاں انھیں اقدامات کا ثمرہ ہیں۔ اردو کے ان اداروں کو بجٹ کے ساتھ ساتھ خودمختاری بھی دی گئی ہے لیکن بڑا کام صرف روپئے سے نہیں بلکہ اخلاص اور جذبے سے ہوتا ہے۔ جموں وکشمیر، دہلی، بہار اور اتر پردیش میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کہی گئی ہے جو ایک نیک فال ہے۔ جب کسی زبان کا رشتہ روزی روٹی سے استوار ہوتا ہے تو اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات زیادہ روشن ہوجاتے ہیں۔ مگر اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ روزی روٹی کے علاوہ اس کا رشتہ دلوں سے بھی استوار ہو۔ جو بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں، ضرور پڑھیں مگر ان بچوں کو وہاں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اردو والے دوسری زبانیں بھی سیکھیں، ہندی اردو کی بہن اور وطن عزیز کی قومی زبان ہے، اسے سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے، اسے بھی سیکھیں۔ مگر اردو کی قیمت پر نہیں، بلکہ اردو کے ساتھ سیکھیں۔ آج اردو کے حق میں فضا نسبتاً سازگار ہے، حکومتوں کے دلوں میں نرم گوشے پیدا ہو رہے ہیں مگر افسوس کہ اردو کے مخلص جاں نثار کم ہوتے جارہے ہیں۔ فی زمانہ صورت حال یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی اپنی تہذیب اور تاریخ کی بات کر رہا ہے اور اپنی زبانوں کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اردو بولنے والے اپنی شیریں پُرکشش اور ادبی حسن وجمال سے مالامال زبان کو زندہ رکھنے کی ذمے داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔

مختلف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے اُردو ایک زندہ زبان کی طرح پھلی پھولی ہے اور ترقی کی نئی منزلیں طے کررہی ہے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے جو بلاشبہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے اُردو نے دیگر زبانوں کے ساتھ مسابقت کی اور آج ایک زندہ زبان تسلیم کی جارہی ہے۔ لیکن ایثار اور جدوجہد کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھنا محض خوش خیالی ہوگی۔ تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی تدریس کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے اور پڑھانے کی کوشش ناگزیر ہے۔ عام طور پر جن شرائط کے ساتھ اردو کے فروغ کے لئے سہولتیں دینے کا اعلان کیا جاتا ہے وہیں سے دشواریاں بھی حائل کی جاتی ہیں لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں جہاں اور جس سطح پر حکومت نے اردو کو فروغ دینے کا اعلان کیا ہے وہاں ان احکامات پر عمل آوری کو یقینی بنائیں۔

آج ہم مادیت اور صارفیت کے دور سے گزر رہے ہیں ہر چیز کو نفع اور نقصان کی میزان پر پرکھتے ہیں اس لیے ہم اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ ہمارے بچے اردو تعلیم حاصل کرکے روزگار اور کاروبار کے میدان میں دوسرے شہریوں کے مقابلے

میں پیچھے رہ جائیں گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دوسروں سے کم تر نہیں ہیں۔اردو میں شعبہ جات کے علوم وفنون سے متعلق معلومات کا ذخیرہ موجود ہے، اصطلاحات کی کمی نہیں۔قدیم دہلی کالج میں اردو کے ذریعے مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کو اختیار کیا گیا اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو والوں میں اب وہ مایوسی اور ناامیدی کی فضا نہیں جو کبھی تھی۔ایسے میں ۱۹۹۸ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام حیدرآباد میں عمل میں آیا تو گویا اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سارے ملک میں دروازے کھل گئے۔اس میں تمام شعبہ جات کا میڈیم اردو ہے۔چناچہ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک انیس سال کے عرصے میں فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو میں بی اے، بی کام، اور بی ایس سی کورسیز ترتیب وار ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰ میں شروع کیے گئے۔جب کہ پوسٹ گریجویشن میں ایم۔اے (اردو) ۲۰۰۴ء میں، ایم۔اے (تاریخ) ۲۰۰۵ء میں، ایم۔اے (انگریزی) ۲۰۰۶ء میں شروع کیا گیا۔ابتداء میں اُردو یونیورسٹی کے صرف 18 اسٹڈی سنٹر تھے۔پچھلے گیارہ سال میں ملک کی 17 ریاستوں میں اسٹڈی سنٹروں کی تعداد 150 تک پہنچ گئی جہاں بی اے، بی ایس سی، بی کام اور ایم اے میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم بالخصوص پیشہ ورانہ اور عصری تعلیم کے جو نئے امکانات نظر آرہے ہیں وہ انتہائی حوصلہ افزا ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جو کل ہند دائرہ اختیار کی حامل مرکزی یونیورسٹی ہے اپنے منشور کے مطابق اردو ذریعۂ تعلیم کے توسط سے اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور روایتی اور فاصلاتی دونوں طریقوں سے چلائے جانے والے تعلیمی پروگراموں کے ذریعے اردو کے فروغ میں کوشاں ہے۔اردو فاصلاتی تعلیم نے بڑی حد تک فضا بدلی ہے۔اس یونیورسٹی کے قیام سے اردو اور اردو والوں نے گویا ایک حیات نو پائی۔محسوس ہوا جیسے کسی نے سوکھے ہوئے پیڑ کی آبیاری کی ہو، وہ ایک انگڑائی لے کر لہلہانے لگا ہو۔

موجودہ دور میں وہی زبان اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے بازار کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جس کا تعلق پیداوار اور مواصلات کے عمل سے ہو۔جو معقولیت پسندی کی داعی ہو اور جسے صرف اس کے بولنے والوں کا ہی نہیں بلکہ مارکیٹ کا سہارا بھی ہو۔چونکہ اردو ادب صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے بلکہ عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اندر ایسی قوت پیدا کی جائے جس کی بدولت عالمی مارکیٹ میں اس کی پکڑ مستحکم ہو سکے۔اردو وہ زبان ہے جو ہمیں تہذیب یافتہ بناتی ہے اور شائستگی کا ہنر بھی سکھاتی ہے۔فراق گورکھپوری جو اس زبان کے عاشقوں میں تھے اکثر طلبا سے کہا کرتے تھے کہ:

''اردو اس لیے بھی پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو''۔

(بحوالہ ماہنامہ، اردو دنیا، نئی دہلی، اگست ۲۰۰۴ء ص۔۵)

☆☆☆

شاہانہ اقبال
حیدرآباد

بابل کا آنگن

خدیجہ کی ساس کو شریک دواخانہ ہوئے ایک ماہ گذر چکا تھا، انہیں دَمّہ کی شکایت تھی، ڈاکٹروں نے بتایا کہ اُن کے دونوں پھیپڑے بیکار ہو چکے تھے، لہٰذا صحت کی کوئی امید نہیں، پچھلے ایک سال سے علاج کروایا جا رہا تھا، لیکن کوئی خاص اِفاقہ نہیں تھا، ایسے میں کسی بہی خواہ نے مشورہ دیا کہ انہیں کسی یونانی دواخانہ میں داخل کروایا جائے تو دیر سے سہی صحتمند ہونے کی پوری پوری امید ہوسکتی ہے۔ مریم بیگم کے چار بیٹے تھے، سب کے سب خود مکتفی اور خوشحال، ماں سے بہت محبت کرنے والے، بڑی بہو کے چار بچے تھے، دو دو سال کے چھوٹے بڑے، دو بڑے اسکول جاتے تھے اور دو چھوٹے گھر پر رہتے تھے، اس لئے اُس کا ساس کے ساتھ دواخانہ میں رہنے کے بارے میں سوچنا بھی عبث تھا، دوسری بہو کسی کالج میں لکچرر تھی، مہینے کے مہینے بھاری تنخواہ گھر لاتی تھی، ملازمت کی وجہ سے ساس کے ساتھ رہ نہیں سکتی تھی، تیسری بہو کی شادی کو پانچ سال گذر چکے تھے، پہلی بار ماں بننے والی تھی، اس لئے احتیاط کے دور سے گذر رہی تھی، دواخانہ میں رہنے کا سوال تو دور کی بات تھی، اُس نے ساس کی عیادت کو ایک بار بھی دواخانہ میں قدم نہیں رکھا تھا کہ کہیں دواخانے میں موجود جراثیم سے بچے کو نقصان نہ پہنچے، اب رہ گئی چوتھی بہو جس کی شادی کو ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا تھا، اُس کے ہاں کوئی خوشخبری بھی نہیں تھی، اس لئے ہسپتال میں رہنے کی ذمہ داری اُسے سونپی گئی۔

خانگی یونانی دواخانہ امراء کے لئے مختص تھا، وہاں کا علاج کافی مہنگا تھا، شاندار عمارت کے ساتھ مریضوں کو کافی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں، زنانہ مریضوں کے ساتھ عورت خدمت گذار اور مرد پیشنٹ کے لئے مرد اٹینڈر رکھا جاتا تھا۔

مریم بیگم کے بیٹے چاہتے تو ماں کی خدمت کے لئے کوئی ملازمہ رکھ سکتے تھے، لیکن ماں کے جاں نثار بیٹے نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی ماں کو کسی خادمہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔

چھوٹی بہو خدیجہ یوں تو بہت نیک دل اور خدمت گذار لڑکی تھی، لیکن تیمارداری کوئی آسان کام نہیں تھا، صبح کے چھ بجے سے رات نو بجے تک ایک ایک منٹ مریض پر توجہ دینی پڑتی تھی، عیادت کو آنے والوں کو اٹینڈ کرنا ہوتا تھا، اُن کے بے تُکے سوالات کا جواب دینا بھی صبر آزما کام تھا، وہ اپنے طور پر پوری جانفشانی سے ساس کی خدمت کر رہی تھی، پھر بھی آنے والے کسی نہ کسی کمی کی طرف اشارہ کر ہی جاتے، گھر سے تینوں وقت گرما گرم کھانا پہنچ جاتا تھا، دُھلے دُھلائے کپڑے اور ضرورت کی ساری چیزیں مہیا کی جاتی تھیں۔

مسلسل ایک ماہ سے دواخانے میں رہنے کی وجہ سے خدیجہ مُرجھا کر رہ گئی تھی، ایک جیسی مصروفیت نے اُسے تھکا دیا

تھا، اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دو چار دن کو گھر ہو آئے، لیکن گھر کے کسی فرد نے اُس کی اِس ضرورت کو محسوس نہیں کیا، وہ اپنے منہ سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی، بس دل مسوس کر رہ جاتی، رہی سہی کسر عیادت کو آنے والی خواتین نے پوری کر دی، جو مریم بیگم کی عیادت کم کرتیں اور خدیجہ سے ہمدردی کا اظہار زیادہ کرتی تھیں، سب ہی اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ گھر کی ساری بہوؤں کا فرض ہے کہ وہ باری باری مریم بیگم کے ساتھ رہے، شروع شروع میں تو خدیجہ اُن کی باتوں کو ہنس کر ٹال جاتی، لیکن آہستہ آہستہ اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ سب غلط نہیں کہہ رہی تھیں، وہ میاں کے آگے کچھ کہنے کی جُرأت نہیں کر سکتی تھی، میاں بس اتنا خیال رکھتے تھے کہ دن میں دو ڈھائی گھنٹے آ کر اُسے نیند پوری کر لینے کا موقع دیتے تھے، روزانہ بازار سے اخبار یا کوئی نہ کوئی رسالہ خرید کر دے جاتے تھے۔

ایک دن مریم بیگم کی خالہ زاد بہن زینب بیگم عیادت کو آئیں، بہن کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد بڑی شفقت اور ہمدردی سے خدیجہ سے بات کی اور کہا: ''دیکھو! دواخانے میں رہتے رہتے تمہارا کیا حال ہو گیا ہے، بیس سال کے بجائے چالیس سال کی لگ رہی ہو، گھر والوں کو تمہارا بھی خیال رکھنا چاہئے، ایسے تو تم بیمار ہو جاؤ گی، کیا تمہارے والدین بھی کچھ نہیں کہتے؟''

بے چاری خدیجہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا، نفی میں گردن ہلا دی، لیکن اُس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

''تم یوں کرو بیٹی! دو چار دن کے لئے گھر چلی جاؤ، میں آپا کے ساتھ یہاں رہ جاؤں گی''، زینب بیگم کی مشفقانہ باتیں سن کر خدیجہ کو یوں لگا جیسے اُنہوں نے اُس کے زخموں پر پاہے رکھے ہوں، زینب خالہ کی پیشکش پر وہ بہت خوش ہوئی، یہ سوچے سمجھے بنا کہ اُس کا گھر جانا مناسب ہوگا یا نہیں، وہ اپنی محسن کی طرف احسانمندی سے دیکھتے ہوئے اُٹھی اور ایک منٹ ضائع کئے بناء گھر جانے کی تیاری کرنے لگی، اُس نے خالہ کو ضروری ہدایات دیں، دوائیوں اور غذاء کے تعلق سے بھی سمجھایا اور بڑے شوق سے گھر کے لئے نکلی، راستے بھر وہ ایسے مسرور ہو رہی تھی جیسے پہلی بار سسرال جا رہی ہو، وہ اپنے آپ کو بہت سُبک محسوس کر رہی تھی، جیسے ہواؤں کے دوش پر اُڑ کر گھر پہنچی ہو، دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی، داخلی دروازے پر دستک دی تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، اُس کا شوہر فہیم سامنے کھڑا تھا، اُسے دیکھ کر وہ مسکرائی، اندر داخل ہونے کے لئے قدم اُٹھایا تو فہیم کی کرخت آواز سن کر اُس نے قدم واپس اپنی جگہ پر جما لیا:

''امّی کو تنہا چھوڑ کر آئی ہو؟'' فہیم کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، خدیجہ نے اُس کا یہ روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اِس لئے سہم کر کہا: ''نہیں! وہ زینب خالہ آئی تھیں، انہوں نے کہا تم گھر ہو آؤ میں آپا کے پاس رہوں گی''۔

''اُنہوں نے کہا اور تم مان گئیں؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ خود اتنی ضعیف ہیں، امّی کی خدمت کیا خاک کریں گی''، فہیم کی آواز میں کرختگی باقی تھی، خدیجہ ڈری سہمی خاموش کھڑی تھی، اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے، مارے بے بسی کے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں حیران ہوں تمہاری جسارت پر کہ تم میری ماں کو دوسروں کے حوالے کیسے کر آئیں!'' فہیم کا غصہ برقرار تھا، اُس

نے خدیجہ کو گھورتے ہوئے کہا، خدیجہ بے حد پریشان ہوگئی، اُس نے بھولے سے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اُس کے اِس قدم پر فہیم اس قدر برہم ہوجائے گا، اُسے دُکھ یہ سوچ کر ہو رہا تھا کہ مہینے بھر سے دواخانے میں رہنے پر تو اُس نے کبھی ذرا سی خوشی کا اظہار نہیں کیا اور اب اُس کے آنے پر کس قدر ذلیل کر رہا ہے۔

''مجھے ایسی بیوی کی ضرورت نہیں جو میری ماں کے ساتھ ناروا سلوک کرے''، فہیم نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا، ''تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ، خبردار! جو دوبارہ یہاں آنے کی کوشش بھی کی!'' اُس نے کھٹاک سے دروازہ بند کرلیا، اُس کے قدموں کی آہٹ دور ہوتے ہوئے گم ہوگئی۔

خدیجہ آنگن میں کھڑی سوچتی رہی کہ کیا کرے، فہیم کا ردّعمل دیکھ کر وہ بھی غصہ سے لال پیلی ہوگئی، سوچنے لگی اگر میں نے غلطی کی تھی تو مجھے سمجھایا بھی جاسکتا تھا، ٹھنڈے دماغ سے مجھے قائل بھی کیا جاسکتا تھا، میں اگر پھر بھی اپنی ضد پر اَڑی رہتی تو یہ سلوک روا تھا، گھر میں اور بھی بہوئیں ہیں، اُن پر تو بس نہیں چلتا، بس میں ہی پکڑی جاتی ہوں، جیسے میں انسان نہیں کوئی روبوٹ ہوں جو اِن کے اشاروں کی پابند رہوں۔

اُنہیں میری کوئی پرواہ نہیں تو میں کیوں اُن کی پرواہ کروں؟ بہت ہوگیا! ظلم سہتے جاؤ تو ظلم میں مزید اضافہ ہوگا، خدیجہ ایک جھٹکے سے مڑی اور گیٹ سے باہر نکل گئی، اُنا کے مسئلہ نے اُسے وہاں رُکنے نہیں دیا، وہ آٹو میں بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوستی سارے راستے روتی اپنی ماں کے گھر پہنچی، اُس کی ماں نے اُسے اِس حال میں دیکھا تو خدیجہ کے کچھ کہے بنا بہت کچھ سمجھ گئی، خدیجہ نے جب اپنا حال کہہ سنایا تو اُسے گلے سے لپٹا کر رونے لگی، ساتھ میں بین بھی کر رہی تھیں، سارا گھر اُن کے اطراف جمع ہوگیا، چھوٹے بھائی بہن اُنہیں روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگے۔

آدھے گھنٹے بعد جب ماں بیٹی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو چپ کر کے بیٹھ گئیں، اُسی وقت خدیجہ کے ابو باہر سے آئے، گھر کا ماحول دیکھ کر پریشان ہوگئے، گھبرا کر پوچھا: ''کیا ہوا؟'' اُن کے اِس سوال پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں، اُنہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں، دونوں کو خاموش پا کر اُنہوں نے جھلاّ کر پوچھا: ''آخر مجھے بھی کوئی بتائے گا کہ ہوا کیا ہے؟''

خدیجہ کی ماں نے رُندھی ہوئی آواز سے میاں کو سب کچھ بتادیا۔

''لاحول ولا قوۃ'' خدیجہ کے ابّو سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے، اُن کی حالت دیکھ کر خدیجہ رونے لگی۔

''بیٹی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ شادی کے بعد ہنسی خوشی میاں کے ساتھ گھر آؤ گی تو ہمارے گھر کے دروازے تمہیں آدھی رات کو بھی کھلے ملیں گے، شوہر کی ناراضگی کے باعث تنہاء گھر آؤ گی تو گھر آنے کی اجازت نہیں دوں گا، پھر تم یہاں کس امید پر آئی ہو؟'' خدیجہ کے ابو نے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میاں کی بات سن کر خدیجہ کی ماں برہم ہوگئیں اور میاں سے بولیں: ''بیٹی کو دلاسہ دینے کے بجائے یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو سمجھی تھی کہ آپ فہیم کو بُلا کر اُس سے بات کریں گے''۔

''ہرگز نہیں!'' وہ غصہ سے بولے، ''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں جو اِس مشکل گھڑی میں بات کو طول دے کر مزید بگاڑ

دوں، میں تو اُسے اَبھی ہسپتال چھوڑ کر آؤں گا، اِس ناسمجھ نے ساس کو چھوڑ کر آنے کی حماقت کیوں کی؟''

باپ کا غصہ دیکھ کر خدیجہ بُری طرح سہم گئی، اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے، وہ بڑی بے چارگی سے بولی: ''ابّو جی! کیا میں اُس گھر کی تنہاء بہو ہوں جو مجھے ہی پابند کیا جاتا ہے؟''

بیٹی کی بات سن کر اُس کے ابو اُس کے بازو تخت پر بیٹھتے ہوئے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے، پھر اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: دیکھو بیٹی! یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں بلکہ تمہیں تو اپنی ساس کی خدمت اور شوہر کی فرمانبرداری کر کے گھر بھر کا دل جیت لینا چاہئے، ذرا سرکاری دواخانے میں جا کر دیکھو، دیہات سے ایک مریض کے ساتھ تین چار لوگ آتے ہیں، نہ رہنے کا بندوبست، نہ کھانے کا انتظام، مریض کے صحتمند ہونے تک سڑک کے کنارے چولہا لگا کر پکاتے اور کھاتے ہیں، جہاں جگہ ملی تھوڑی سی دیر سو جاتے ہیں، بیمار کے لئے سب ہی تکلیف اُٹھاتے ہیں، یہ ہوتی ہے انسانیت اور رشتوں سے محبت، تم ذرا سا صبر و تحمل سے کام لو تو یہ وقت بھی گذر ہی جائے گا، دیکھو بیٹی مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوگی، نہ مجھے نہ فہیم کو!''

تین گھنٹے کے اندر اندر خدیجہ پھر سے دواخانے میں تھی، اپنی ساس کی خدمت کرتے ہوئے سوچ رہی تھی، غلطیاں تو سب ہی کرتے ہوں گے، لیکن جن لڑکیوں کو بابل کے آنگن سے بروقت نصیحتوں کی کلیوں کا تحفہ ملتا ہے وہ اُن سے اپنی زندگی کو سجا کر گلزار بنا لیتی ہیں۔ ملاقات کا وقت شروع ہوتے ہی فہیم وارڈ میں داخل ہوا، ماں کے سرہانے بیٹھی خدیجہ سے ماں کے تعلق سے پوچھا اور دونوں میں اِس طرح بات چیت ہونے لگی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے کا ناخوشگوار حادثہ اُن کی زندگی میں ہوا ہی نہ ہو۔

فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کریں

انسان کو اپنی زندگی کو خوشگوار بنانا ہو، چین و سکون، راحت و آرام سے زندگی بسر کرنا ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے۔ یہ دیکھے کہ مجھ سے کون سا ایسا عمل چھوٹ رہا ہے جس کی وجہ سے میری زندگی میں تکالیف، مشکلات، پریشانیاں اور بے چینیاں پھیل رہی ہیں، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ میں نے اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں کا کتنا شکر ادا کیا ہے؟ کیا میں نے کبھی غور کیا کہ میرے رب نے مجھے کسی کا محتاج نہیں بنایا، میرے ہاتھ پاؤں سلامت رکھے، عقل سلیم دی، چلنے پھرنے، دیکھنے، بولنے، سننے کی طاقت دی۔ ہر قسم کے لوازمات چکھنے زبان میں مزہ دیا۔ پھر بھی میں نے اس کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی برتی۔ مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ کیا میں نے کبھی غریبوں محتاجوں، بے کسوں، ضرورت مندوں، بیواؤں، یتیموں، اسیروں، مسافروں کی خبر گیری کی۔ کیا کبھی میرا ہاتھ ان لوگوں کی اعانت کے لئے اپنی جیب تک گیا؟ ہمارے کتنے لاچار و مجبور پڑوسی ایسے ہیں جو کسی سے اپنی لاچاری اور مجبوری کا ذکر نہیں کرتے۔ ہاں آج بھی ایسے لوگ ہمارے اڑوس پڑوس میں رہتے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ کیا ہم نے کبھی ان کی خبر لی ہے؟ ان گھروں میں کئی کئی لڑکیاں بغیر شادی کے بیٹھی ہیں۔ ان کے والدین ان کی فکروں میں ضعیف ہو گئے۔ کیا ہم نے کبھی ان کا خیال کیا ہے۔ ہم باہر تو بڑے مقطع چقطع بنے پھرتے ہیں لیکن اپنے گھروں میں اپنے اڑوس پڑوس میں انتہائی بدخو، بداخلاق بنے رہتے ہیں۔ ہم نے کبھی ان چیزوں پر غور نہیں کیا کہ یہ قول و فعل کا تضاد ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے سوچیں، غور کریں، اپنی فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کریں اور اپنے زندگیوں کو خوش گوار بنائیں۔

oOo

محمد ارشد
ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی
لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ (یو۔پی)

چمڑے کا احاطہ

شہر کی سب سے پرانی ہائڈ مارکیٹ ہماری تھی۔ ہما را احاطہ بہت بڑا تھا۔ہم چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔مرے ہوئے جانوروں کی کھالیں ہم خریدتے اور ان کا چمڑا بنا کر بیچتے تھے۔ ہمارا کام اچھا چلتا تھا۔ ہما ری ڈیوڑی میں دن بھر ٹھیلوں ، بیل گاڑیوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی ۔کئی بار تو ایک ہی وقت میں ایک طرف کچھ ٹھیلے ہمارے گودام میں دھول پوش کھالوں کی لدانیں اتار رہے ہوتے تو اسی وقت دوسری طرف تیار شدہ پرت دار چمڑہ ایک ساتھ بیل گاڑیوں میں لدوایا جا رہا ہوتا۔ڈیوڑی کے عین اوپر ہمارا دو منزلہ مکان تھا۔مکان کی سیڑیاں سڑک پر اترتی تھیں۔اور ڈیوڑی و احاطے میں گھر کی عورتوں و بچوں کا قدم رکھنا بالکل منع تھا۔

ہمارے والد کی دو بیویاں تھیں۔ بھائی اور میں ابّو کی پہلی بیوی سے تھے۔ ہما ری ماں کی موت کے بعد ابّو نے دوسری شادی کی تھی۔ سوتیلی ماں سے تین بچے ہوئے لیکن ان میں سے سوائے ایک لڑکے کے کوئی اولاد زندہ نہ رہ سکی۔ میرا سوتیلا بھائی اپنی ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ مجھ سے بھی ان کا لگاؤ بہتر ہی تھا۔ پر میرا بھائی ان کو بالکل بھی نہ بھاتا تھا۔ بھائی شروع سے ہی جھگڑالو طبیعت اور بحث تکرار کا عادی تھا۔ہم بچوں کے ساتھ وہ تو تو ، میں میں کرتا ہی ، ابّو سے بھی بات بات پر حجت کرتا۔ پھر ابّو بھی اسے کچھ نہ کہتے۔

میں یا سوتیلا اسکول نہ جاتے یا اسکول کی پڑھائی کے لیے نہ بیٹھتے ، یا رات میں ابّو کے پیر نہ دباتے تو ابّو سے خوب ڈانٹ کھانے کو ملتی ، مگر بھائی کئی دن اسکول سے غائب رہتا اور ابّو پھر بھی بھائی کو دیکھتے ہی اپنی زبان اپنے تالو سے ملا لیتے۔

راز ہم پر اچانک ہی کھلا ، بھائی نے ان دنوں کبوتر پال رکھے تھے۔ساتویں جماعت میں وہ دو بار فیل ہو چکا تھا۔اور اس سال بھی وہ امتحان دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

چھت پر کبوتر رہتے تھے۔ احاطے میں خالوں کے خمیر و گوشت کے نچے ہوئے ٹکڑوں کی وجہ سے اکثر چیلیں و کوّے منڈرایا کرتے تھے۔ بھائی کے کبوتر اسی لیے

بکسے میں رہتے تھے۔ بکسہ بہت بڑا تھا۔ بکسے ایک سرے پر الگ الگ خانوں میں کبوتر سوتے، اور باقی کبوتر آنگن میں میں اڑان بھرتے، دانہ چگتے، پانی پیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ غٹرغوں کرتے۔

بھائی صبح اٹھتے ہی اپنی کاپی کے ساتھ کبوتروں کے پاس جا پہنچتا۔ کاپی میں کبوتروں کے نام، اور انڈوں و بچوں کا حساب وکتاب رہتا۔ سوتیلا اور میں اکثر بھائی کے پیچھے پیچھے آجاتے۔ کبوتروں کے لیے پانی لگانا ہمارے ذمہ تھا۔ بنا کچھ بولے بھائی کبوتروں والی خالی بالٹی ہمارے ہاتھ میں پکڑا دیتا اور ہم نیچے نل کی طرف چل دیتے۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں جب ہم چھوٹے تھے تو گھر میں پانی نل سے ہی لیا جاتا تھا۔

گرمیوں کے ان دنوں میں کبوتروں والی بالٹی ٹھنڈے پانی سے بھرنے کے لیے میں اور سوتیلا باری باری سے ایک دوسرے کی بالٹی بھرتے اور اس کے بعد ہی کبوتروں کا پانی چھت پر لیکر جاتے۔

''آج کیا لکھا؟'' بالٹی پکڑاتے وقت ہم بھائی سے پوچھتے۔

''کچھ نہیں'' بھائی اکثر ہمیں ٹال دیتا اور ہم دل کو تسلّی دے کر دور سے کبوتروں کو ترچھی نظروں سے نہارتے رہتے۔

اس دن ہمارے ہاتھ سے بالٹی لیتے وقت بھائی نے خود بات چھیڑی ''آج بڑی کبوتری بیمار ہے''۔

''دیکھیں'' سوتیلا اور میں خوشی سے اچھل پڑے۔

''دھیان سے'' بھائی نے بیمار کبوتری میرے ہاتھ میں دیدی۔

سوتیلا کی نظر ایک ہٹّے کٹّے کبوتر پر جاٹکی۔

''کیا میں اسے ہاتھ میں لے لوں'' سوتیلے نے بھائی سے فرمائش کی۔

''یہ بہت چنچل ہے، ہاتھ سے نکل کر کبھی بھی بے قابو ہوسکتا ہے''۔

''میں بہت دھیان سے پکڑوں گا''

بھائی کا ڈر سہی ثابت ہوا۔ سوتیلے نے ابھی اسے اپنے ہاتھوں میں دبوچا ہی تھا، کہ وہ چھوٹ کر منڈیر پر جا بیٹھا۔ بھائی اس کے پیچھے دوڑا۔ خطرے سے بے خطر کبوتر بھائی کو چڑھاتا ہوا ایک منڈیر سے دوسری منڈیر پر آجانے لگا۔ تبھی ایک بڑی سی چیل نے کبوتر پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ کبوتر فرتیلا تھا۔ پوری طاقت لگا کر فرار ہوگیا۔ چیل نے تیزی سے کبوتر کا پیچھا کیا۔ بھائی نے بڑھ کر پتھر سے چیل پر بھرپور وار کیا۔ لیکن چیل نے ذرا دیر پھڑ پھڑا کر اپنی رفتار تیز کرلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کبوتر اور چیل ہماری آنکھوں سے غائب ہوگئے۔

غصے میں آکر بھائی نے سوتیلے کو پکڑا اور اسے بے تحاشہ پیٹنے لگا:

سوتیلے نے گھبرا کر اپنی ماں کو پکارا۔

سوتیلی ماں فوراً اوپر چلی آئیں۔

سوتیلے کی حالت ان سے دیکھی نہ گئی۔

''اسے چھوڑ دے'' وہ چلائیں، نہیں تو تیرے باپ کو بلالوں گی۔ وہ تیرا گلا کاٹ کر تیری نعش اسی ٹنکی میں پھینک دے گا۔

''کس ٹنکی میں'' بھائی سوتیلے کو چھوڑ کر سوتیلی ماں کی طرف مڑا۔

''میں کیا جانوں کس ٹنکی میں؟''

سوتیلی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

ہمارے احاطے کے دالان کے آخری کونے پر پانی کی دو بڑی ٹنکیاں تھیں۔ ایک ٹنکی میں آئی ہوئی نئی کھالیں، نمک، نوسادر، اور گندک ملے پانی میں ہفتوں پھولنے کے لیے چھوڑ دی جاتی تھیں۔ اور دوسری ٹنکی میں خمیر اٹھی کھالوں کو کھرچنے سے پہلے دھویا جاتا تھا۔

''بولو، بولو''۔ بھائی نے ٹھہو کہ لگایا۔

''تم چپ کیوں ہوگئیں؟''

''چھل اٹھ'' سوتیلی ماں نے سوتیلے کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

''میں سب جانتا ہوں'' بھائی پھر ہنسا۔

''پر میں کسی سے نہیں ڈرتا، میں نے شیرنی کا دودھ پیا ہے، کسی گیدھڑی کا نہیں۔۔۔۔''

''تم نے گیدھڑی کسے کہا؟'' سوتیلی ماں پھر بھڑکیں۔

''گیدھڑی کو گیدھڑی کہا ہے'' بھائی نے سوتیلی ماں کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ایک نہیں دو بیٹیاں ٹنکی میں پھینکی گئیں، پر تمہاری رنگت ایک مرتبہ بھی نہیں بدلی۔ میری شیرنی ماں نے جان دیدی مگر جیتے جی کسی کو اپنی بیٹیوں کا گلا نہیں گھونٹنے دیا۔۔۔''

''تو بھی میرے ساتھ چل'' غصے میں سوتیلی ماں نے میری طرف دیکھا۔ ''آج میں نے ناشتے میں تم لوگوں کے لیے جلیبی منگوائی ہیں''۔

جلیبی مجھے بہت پسند تھیں لیکن میں نے بیمار کبوتری پر اپنی پکڑ بڑھادی۔

''تم جاؤ'' سوتیلے نے اپنی ماں کی باہوں سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا ''ہم لوگ بعد میں آئیں گے''۔

''ٹھیک ہے'' سوتیلی ماں رکی نہیں۔ نیچے اترتے ہوئے کہہ گئیں، ''جلدی آجانا جلیبی ٹھنڈی ہورہی ہیں''۔

''لڑکیوں کو ٹنکی میں کیوں پھینکا گیا؟'' میں نے بھائی کے بہت نزدیک جاکر پوچھا۔

''کیوں کہ وہ لڑکیاں تھیں''

''لڑکی ہونا کیا خراب بات ہے؟'' سوتیلے نے پوچھا۔

''ابّو سوچتے ہیں کہ لڑکیوں کی ذمہ داری نبھانا بہت مشکل بات ہے''۔

''کیسی مشکل؟''

''پیسے کی مشکل'' ان کی شادی میں بہت پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے''۔

''ہمارے پاس تو بہت پیسہ ہے'' میں نے کہا۔

''پیسہ ہے تبھی تو اسے بچانا ضروری ہے'' بھائی ہنسا۔

''ماں کیسے مری؟'' میں نے پوچھا۔

''ماں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا، گھر میں ان کی کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ چھوٹی لڑکی کو لے کر ابّو نے ان سے خوب لڑائی کی۔ ان کو بہت مارا پیٹا۔ لیکن وہ بہت بہادر تھیں۔ بڑی بہادری سے انھوں نے ابّو کا مقابلہ کیا۔ لیکن ابّو میں زیادہ طاقت تھی۔ انھوں نے زبردستی ماں کے منہ میں ماں کا دوپٹّہ ٹھونس دیا۔ اور ماں مرگئی۔۔۔''

''تم نے انھیں چھڑایا نہیں؟''

''میں نے بہت کوشش کی تھی۔ ابّو کے مونڈھے پر بیٹھ کر کئی بار نوچا، ان کی ٹانگ پر چڑھ کر کئی بار دانتوں سے کاٹا بھی، پر ایک زبردست گھونسا انھوں نے میرے منہ پر ایسا مارا کہ میرے دانت وہیں بیٹھ گئے''۔

''ابّو کو پولس نے نہیں پکڑا؟''

''نہیں! پولس کو کسی نے بلایا ہی نہیں''۔

''وہ کیسی تھیں؟'' مجھے ان کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی۔

''انھیں موتیوں کا بہت شوق تھا۔ موتی پرو کر انھوں نے کئی مورتیں بنائی تھیں۔ بازار سے ان کی پسند کے موتی میں ہی انھیں لا کر دیتا تھا۔

''انھیں پرندے بہت اچھے لگتے تھے؟'' سوتیلے نے پوچھا۔ سبھی مورتوں میں پرندے ہی پرندے ہیں۔ گھر کی لگ بھگ سبھی دیواروں پر مورتیں ہیں''۔

''ہاں! انھوں نے کئی مور، کئی توتے اور کئی کبوتر بنائے۔ کبوتر انھیں بہت پسند تھے۔ کہتی تھیں کبوتر میں عقل بھی ہوتی ہے اور وفا داری بھی۔۔۔ کبوتروں کی کہانیاں انھیں بہت آتی تھیں۔۔''

''میں وہ کہانیاں سنوں گا'' میں نے کہا۔

''میں بھی'' سوتیلے نے کہا۔

''پر انھیں چمڑے سے بڑا بیر تھا۔ دن میں وہ سیکڑوں بار تھوکتیں اور کہتیں، اس موئے چمڑے کی سڑاندھ (بو) تو میرے کلیجے میں آ گھسی ہے۔ تبھی تو میرا کلیجا ہر وقت سڑتا رہتا ہے۔۔۔''۔

''مجھے بھی چمڑا اچھا نہیں لگتا'' سوتیلے نے کہا۔

''بڑا ہو کر میں احاطہ چھوڑ دوں گا''۔ بھائی مسکرایا۔

''دور کسی شہر میں چلا جاؤں گا۔ وہاں جا کر موتیوں کا کارخانہ لگاؤں گا۔۔۔''

اس دن جلیبی ہم تینوں میں سے کسی نے نہ کھائی۔

☆☆☆

تہذیب وتمدن کی نشانی اُردو کو باقی رکھئے

اپنی تہذیب، تمدن، ثقافت واقدار کو زندہ رکھنا ہو تو ہمیں چاہیے کہ اپنی زبان کو طاقت وقوت بخشیں۔ اس کیلئے کوئی ٹانک، کوئی انجکشن، کوئی دوا اور کھاد کی ضرورت نہیں بلکہ زبان کو طاقت اس کے سیکھنے، لکھنے اور پڑھنے سے ملے گی۔ اس کو آگے بڑھانا ہو تو اسے اپنی نئی نسل میں اُسی طرح پہنچانا ہوگا جیسے ہمارے اسلاف نے اس پیاری نیاری زبان ''اُردو'' کو ہمارے حوالے کیا تھا، تب جا کر ہماری تہذیب، تمدن، ثقافت باقی رہے گی۔ **اُردو زندہ باد**

oOo

صلاح الدین نیّر
ملے پلی، حیدرآباد

غزلیں

کس بے گُنہ کو تم نے گُنہ گار لکھ دیا
زیتون جیسی شاخ کو تلوار لکھ دیا

جو لوگ سر اُٹھانے کے قابل کبھی نہ تھے
لوگوں نے اُن کو صاحبِ دستار لکھ دیا

جو ہوگئے فرار قبیلے کو چھوڑ کر
اُن کو بھی تم نے قافلہ سالار لکھ دیا

لفظوں کے انتخاب نے دھوکہ دیا تمہیں
کس کی خطا تھی کس کو خطاکار لکھ دیا

قائم ہے جن سے شہر میں رشتوں کی آبرو
اُن کو گنہ گاروں کا سردار لکھ دیا

تاعمر دوستی کی جڑیں کاٹتا تھا جو
تم نے اُسے بھی صاحبِ کردار لکھ دیا

کتنے مکان ملبے میں تبدیل ہوگئے
کس بے ہنر کو آپ نے معمار لکھ دیا

اِک جنبشِ قلم ہی سے اربابِ فکر نے
جو بے وفا تھے اُن کو وفادار لکھ دیا

ہرایک جنگ میں جوشہیدوں کی صف میں تھے
نیّر ان ہی کو لوگوں نے غدار لکھ دیا

oOo

ہر ایک ذرّہ بارِ امانت سے ڈرگیا
اک میں ہی تھا کہ تیرے مقابل ٹھہر گیا

دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر
وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کرگیا

اِس دورِ انتشار کا یہ بھی ہے حادثہ
تہذیب زندہ رہ گئی، انسان مرگیا

میں اپنے گھر کے لوگوں میں رہتا تھا مطمئن
میرا وجود آپ کی خاطر بکھر گیا

اُس وقت ہی سے خانہ بدوشوں کے ساتھ ہوں
میں تم کو چھوڑتے ہوئے کب اپنے گھر گیا

وہ بھی کبھی تھا اپنے قبیلے کا آدمی
جو ہنستے ہنستے آیا تھا با چشمِ تر گیا

اب تک بھی جس کو چُھونے کی نیّر ہے آرزو
وہ لمحۂ عزیز نہ جانے کدھر گیا

oOo

ڈاکٹر مسعود جعفری
حیدرآباد

غزلیں

رچی ہوئی ہے ترے روپ میں ہماری غزل
گلوں کی قیمتی سوغات ہے یہ ساری غزل
مشاعرے میں پڑھی ہے جو اشتہاری غزل
مزار میرؔ سے اٹھ کر بہت پکاری غزل
مہیں سے مانگے ہے خیرات یہ بھکاری غزل
اسے بنادو ذرا آج چمتکاری غزل
ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں رات بھر باتیں
لہو نچوڑ ہی لیتی ہے تیز دھاری غزل
اسے ہی ساتھ لئے منزلوں پہ چلتے ہیں
ہمیں عزیز رہی پتھروں سے بھاری غزل
مچل رہی ہے سرشام زلف بکھرائے
ترے فراق میں دن رات جو نکھاری غزل
سنیں تو آگ سی لگ جائے دل کے ایواں میں
وہی ہماری غزل ہے وہی تمہاری غزل
نہ جانے کون سے رستہ پہ وہ چلی جائے
کھڑی ہوئی ہے سر راہ مری پیاری غزل
کوئی بھی جام کہاں ہونٹ تک پہونچتا ہے
سراپا رقص ہو محفل میں جب خماری غزل
بدل بھی لیتی ہے ملبوس جعفریؔ دن رات
کبھی ہے مست قلندر کبھی مداری غزل

oOo

انساں سے رویہ ترا شدّاد کیوں لگا
جنت نشان ملک مرا برباد کیوں لگا
کچھ لوگ مہر صبح کو آداب کہہ چکے
یہ حکم یہ دباؤ بھی بیداد کیوں لگا
کتنے ہی لوگ قتل ہوئے گاوں میں مرے
ہر ظلم ترا نت نئی ایجاد کیوں لگا
آنکھوں سے کوچ کرگئے آنسو ہزار ہا
ویرانہ ہائے ان دنوں آباد کیوں لگا
پگڑی ہماری گرگئی ماتم زدہ ہیں ہم
یہ سانحہ بھی ورثہ اجداد کیوں لگا
آہیں بھی لوٹ آتی ہیں ٹکرا کے ان دنوں
یہ تیرا نظم عام بھی برباد کیوں لگا
دیکھا گیا ہے آج بھی صحرا کے آس پاس
یہ جعفریؔ بھی دور سے فرہاد کیوں لگا

oOo

ڈاکٹر رؤف خیرؔ
9-11-137/1
موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد۔500 008 (تلنگانہ)

غزلیں

پنجرے کے پرندوں کو صیاد نے مارا ہے
زنجیر غلاموں کو آزاد نے مارا ہے
بیٹے کو کسی کے یوں دیوزاد نے مارا ہے
جیسے کسی بھٹو کو جلّاد نے مارا ہے
جب جب بھی جنھیں زعم تعداد نے مارا ہے
ایسوں کو تو مٹھی بھر افراد نے مارا ہے
ماں باپ کا سینہ ہے یا شہر خموشاں ہے
بچوں کی ہلاکت کی روداد نے مارا ہے
ہے جُرم حقیقت میں ناکردہ گناہی بھی
دھوکے سے اگر ابنِ زیاد نے مارا ہے
انصاف کے مارے تو ایسے بھی ہیں ویسے بھی
ماقبل کبھی حکمِ مابعد نے مارا ہے
برباد ہوئے جن کی دنیا وہ بنائے ہیں
ماں باپ کو ایسی ہی اولاد نے مارا ہے
دونوں ہی طرح مارا جانا تھا ہمیں گویا
دیدار نے مارا تھا اب یاد نے مارا ہے
اغیار کے ہاتھوں ہم مارے نہیں جاسکتے
اپنی ہی طبیعت کی افتاد نے مارا ہے
وہ خیرؔ مزے لوٹے، اب ہم جو پریشاں ہیں
نادانیِ آبا و اجداد نے مارا ہے

oOo

اب ہوکے رہ گئے ہیں تبرک سنبھال رکھ
ماں باپ ہیں کہ شیشۂ نازک سنبھال رکھ
بوسیدہ ہوگئے ہیں یہ اوراقِ زندگی
ہے اور چھورہی نہ کوئی تک سنبھال رکھ
چیلوں کی سلطنت ہے کھلے آسمان پر
اپنے کبوتروں کا بھی کابک سنبھال رکھ
تیرے خلاف ہوں نہ یہ سرکس کے جانور
تو رِنگ ماسٹر ہے تو چابُک سنبھال رکھ
باہر پٹارویوں سے کئی سانپ آگئے
تو منتر ا ور عصائے تدارک سنبھال رکھ
تو بھی گیا سمجھ یہ اگر ہاتھ سے گیا
سینے سے ہی لگا کے تمسک سنبھا ل رکھ
اندھا یہ اعتقاد کسی کام کا نہیں
بنیاد ہے یقیں کی تشکک سنبھال رکھ
تیشے ہی کی زبان سمجھتے ہیں سنگ دل
اِن پتھروں کے سامنے مت جُھک سنبھال رکھ
اثباتِ خیرؔ بھی ہے کہیں ردِّ شر بھی ہے
یہ نظم ذکرِ خیرؔ ہے توزک سنبھال رکھ

oOo

محمد محبوب خان افسر عثمانی

3-5-74 کوٹلہ شیخان اسٹریٹ،
عقب سواران اسکول، کریم نگر

غزلیں

گردشِ وقت سے معدوم ہوئے ہیں ہم لوگ
شاکیٔ مرضیٔ مقسوم ہوئے ہیں ہم لوگ

اپنے اوصافِ شجاعت سے گریزاں ہوکر
خواہشِ نفس کے محکوم ہوئے ہیں ہم لوگ

اپنے اعمالِ خبیثہ کی ہے پاداش سُنو!
نصرتِ رب سے بھی محروم ہوئے ہیں ہم لوگ

وقتِ رخصت کی ہمیں فکر کہاں ہے بھائی
نہ ملی دنیا تو مغموم ہوئے ہیں ہم لوگ

توڑدی ساری حدیں خواہشِ دل کی خاطر
اپنی من مانی سے موسوم ہوئے ہیں ہم لوگ

دورِ حاضر کی ترقی سے ہمیں کیا صاحب
اپنی ہی ذات میں مختوم ہوئے ہیں ہم لوگ

وقت پر جاگے نہیں پھر بھی گِلہ کرتے ہیں
اس غلط فکر سے مرسوم ہوئے ہیں ہم لوگ

اختلافات کی دنیا کو سجا کر افسؔر
اپنی بربادی کے مرقوم ہوئے ہیں ہم لوگ

oOo

سمندروں کی تہوں کو کھنگال لائے ہیں
ادب کے سانچے وہ موتی نکال لائے ہیں

چمک سے جن کی منوّر ہوا جہاں سارا
ہم اپنے کاسے میں اختر مثال لائے ہیں

متاعِ لوح و قلم اب بھی دسترس میں ہے
لہو سے رقم حقیقت اُجال لائے ہیں

ہماری خو میں جو خوبیٔ حق بیانی ہے
بہ فیضِ روزیٔ کسبِ حلال لائے ہیں

جِلا ہوئی نہیں پیدا ہمارے فن میں یوں ہی
ریاضتوں کے وسیلے کمال لائے ہیں

بدی کا زور ہے دنیا میں چار سُو افسؔر
ہم اپنے ہاتھوں ہی قحط الرّجال لائے ہیں

oOo

عمران راقم
3 گرانٹ اسٹریٹ
کولکتہ-7000013(مغربی بنگال)

غزلیں

یہ اعتراف ہے مجھ کو گناہ کرتا ہوں
تمہارے عشق میں خود کو تباہ کرتا ہوں

سہانی رات اکیلے میں جب بھی ہوتی ہے
قلم سے اور بھی کاغذ سیاہ کرتا ہوں

مرے وجود پہ غالب ہے تیرا غم لیکن
خوشی خوشی میں مسلسل نباہ کرتا ہوں

لہو شریک ہے میرا بدن کی بو میں ترے
میں اپنی روح کو اس کا گواہ کرتا ہوں

سنہرے خواب کا آنا بھی اک حقیقت ہے
تری پناہ میں آنے کی چاہ کرتا ہوں

تجھے خدا کی قسم ہے مری پناہ میں آ
نہیں تو خود کو ہی میں بے پناہ کرتا ہوں

ترے نہ آنے سے یہ دم نکل بھی سکتا ہے
اخیر بار تجھے انتباہ کرتا ہوں

ترے جمال کا سایہ نظر میں پھرتا ہے
جنوں میں اپنی طرف جب گناہ کرتا ہوں

تو میری زیست کا حاصل ہے اس لئے راقمؔ
تری ہی ذات سے جینے کی چاہ کرتا ہوں

oOo

ہے کاغذ قلم کی سیادت نہیں
مرے ہاتھ میں تو نظارت نہیں

خدا تیری دنیا میں رہتے ہوئے
مکمل مری کوئی حاجت نہیں

بصارت سے محروم انسان ہے
وگرنہ کہاں اس کی قدرت نہیں

چراغِ وفا بن کے جلتا رہوں
کسی سے بھی ہو مجھ سے نفرت نہیں

شریکِ سفر ہیں مرے غم بہت
مری رازداں آج فرصت نہیں

حقیقت ہے یہ آدمی کی طرح
فرشتے اُٹھائیں گے زحمت نہیں

سلامت رہے بانہہ بازو خدا
کسی سے بھی لوں کوئی خدمت نہیں

کوئی کام آسان ہوتا ہے کیا
نصابِ وفا ہے ریاضت نہیں

حلف نامے میں ہے فقط دستخط
سوا اس کے کوئی عبارت نہیں

فقیروں سی مجھ کو طبیعت ملی
مری خو میں راقمؔ رعونت نہیں

oOo

کِشور سلطانہ
پازیٹیو پویلین، شانتی نگر
حیدرآباد۔(تلنگانہ)

غزلیں

یہ تیرا غم ہے کوہِ گراں کی طرح
اور ترا ساتھ ہے لُطفِ جاں کی طرح
گر عیاں ہو خطا تو سزا بھی ملے
ہم رہے دل میں دردِ نہاں کی طرح
دھڑکنیں اُن حسیں لمحوں کی آج تک
پاس رکھی ہیں برقِ تپاں کی طرح
زندگی آج بھی ہے پریشاں مگر
کل سنور جائے گی جسم و جاں کی طرح
وہ مِرا خواب تھا یا کوئی آرزو
یاد ہے ایک مٹتے نشاں کی طرح
زرد موسم خزاں کے گزر ہی گئے
فصلِ گُل اب ہے اک مہرباں کی طرح
قافلہ اُس کی یادوں کا کِشورؔ ابھی
گلشنِ دل میں ہے باغباں کی طرح

oOo

آج پھر اُن شُوخ نظروں کا اشارہ ہوگیا
اک ستم کیا کم تھا کِشورؔ پھر دوبارہ ہوگیا
چاند تارے جگمگائے کہکشاں بھی ہنس پڑی
جب اُٹھی تیری نظر، دلکش نظارہ ہوگیا
برگِ گُل پر سو رہا تھا ایک قطرہ اشک کا
چُھوگئی تیری نظر، روشن ستارہ ہوگیا
زندگی نے رنگ اپنے ایسے کچھ بدلے یہاں
جو فسانہ تھا تمہارا وہ ہمارا ہوگیا
شاخِ گُل دیکھا تو سمجھا چاند کا ہالہ حسیں
گویا پھر ہر ایک چہرہ بس تمہارا ہوگیا
چھا گیا دن رات پر میرے وہ کِشورؔ اس طرح
مل گئی ایسی خوشی ہر غم گوارا ہوگیا

oOo